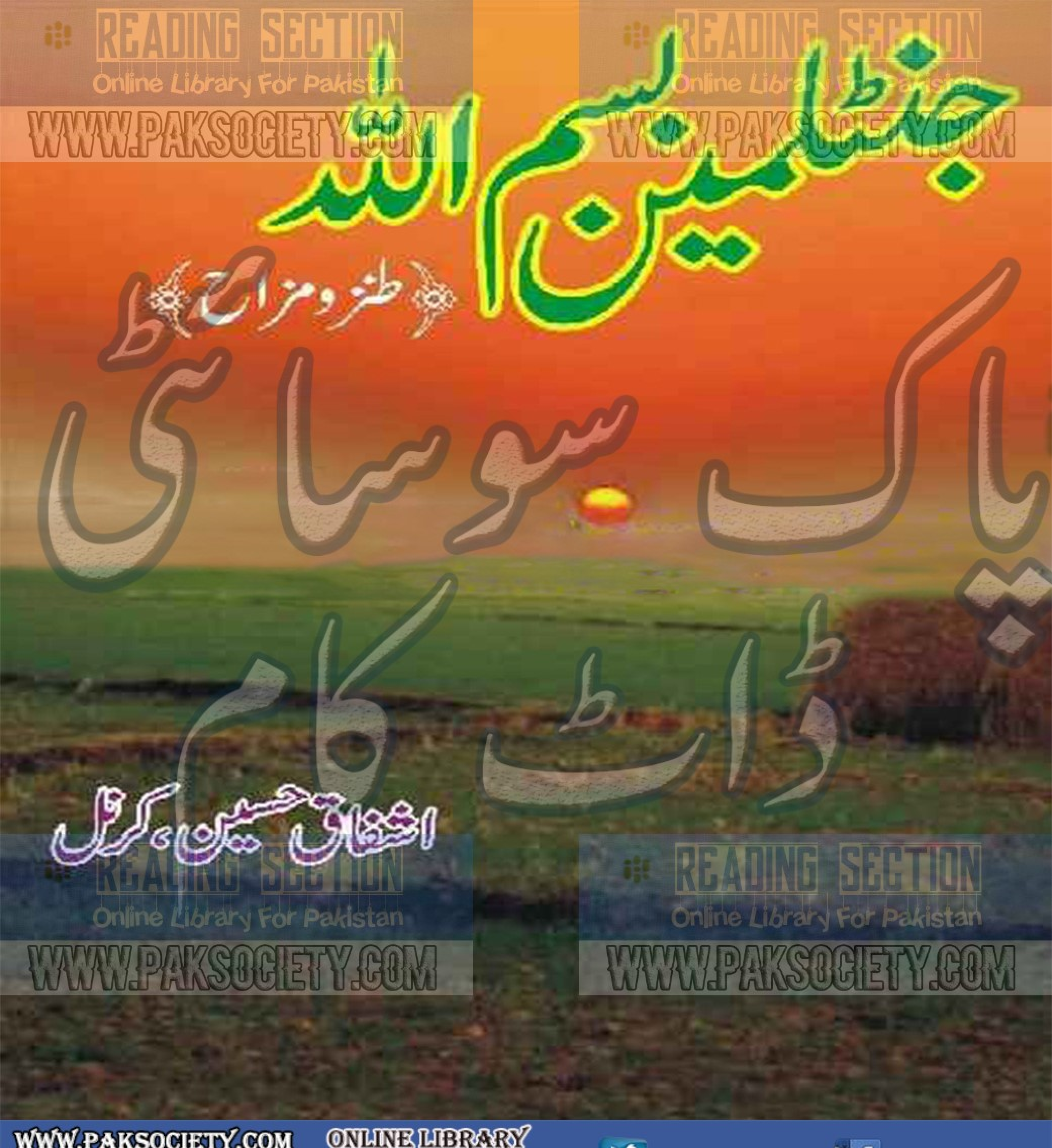

جنٹلمین بسم اللہ
طنز و مزاح
اشفاق حسین، کرنل

باعثِ تحریر آنکہ....

نئی افسری میں اِک نشہ سا ہوتا ہے۔ خمار کی سی کیفیت، سرور کا سا کیف۔ کمیشن ملنے کے بعد کی بات ہے۔ ہم ابھی ابتدائی کیفیات ہی میں تھے کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے نکال کر ہمیں ایک انفنٹری یونٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا جو موسم سرما کی فوجی مشقوں میں مصروف تھا۔

سو افسری ملنے کے بعد سرما کی پہلی رُت کچھ اس طرح سے آئی کہ چاندنی راتوں میں پُراسرار سایوں کے رُوپ میں ہم صحراؤں کی خاک پھانتے پھرتے تھے۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپتا تو ہم دشمنوں کے کسی جتھے سے دوچار ہو کر دشمن کی کمین گاہ پر ٹوٹ پڑتے۔ بدلیاں اُڑ جاتیں تو ہمیں وادیوں میں بکھرا ہوا پاتیں۔ سورج طلوع ہوتا تو جانے مُنہ اندھیرے سے دشمن کی تلاش میں روانگی کے لیے تیار ہوتے۔ سارا سارا دن گھات لگائے دشمن کے منتظر رہتے اور راتوں کو اس کی سُن گُن لینے کے لیے چاروں اور پھیل جاتے۔ دشمن کی نشاندہی پر زوردار حملوں کے منصوبے بنتے اور اس کی قوت میں غیر معمولی اضافے پر دفاعی صورتِ حال پر غور کیا جاتا۔

مزے میں تھے امپائر حضرات۔ چمکتے چاند ستاروں سے مزین، کلف لگی وردیوں میں ملبوس، بازوؤں پر مخصوص پٹیاں لگائے "میدانِ کارزار" میں بے خطر گھومتے پھرتے۔ کبھی ہمارے حملوں کو مجبراً تندانہ اقدام قرار دے کر دشمن کے "تہس نہس" ہونے کا اعلان کر دیا جاتا اور کبھی دشمن کی چالوں کو موثر بنا کر ہماری پوری کی پوری کمپنیاں "شہید" کروا دی جاتیں۔ غالباً شاعر نے فوج کے انہی امپائر حضرات کے بارے میں کہا تھا:

وہ نگاہ ان کی مجاز تھی، کبھی جھک گئی، کبھی اُٹھ گئی
تو ترے بسمل سے یہی ہوا، کبھی جی اُٹھے، کبھی مر گئے

ہم مرنے جینے کی انہی مشقوں میں مصروف تھے کہ ایک دن بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے فوری بلاوے کا پیام آیا۔ "دشمن" کو ہم نے اس کے حال پر چھوڑا اور واپس روانہ ہو گئے ہیڈ کوارٹر میں آکر معلوم ہوا کہ جی ایچ کیو میں ہماری خدمات کی اشد ضرورت ہے اور فوری طور پر راولپنڈی طلب کیا گیا ہے۔ ہماری پوسٹنگ فوج کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ میں ہوئی تھی بس یہیں سے اس کتاب کی وجۂ نزول کا آغاز ہو گیا ہے۔

آئی ایس پی آر سے ایک ہفت روزہ رسالہ نکلتا ہے "ھلال"۔ بہت پہلے سے نکل رہا ہے۔ بنیادی مقصد تھا کہ بارے فوجیوں کو ہلکا پھلکا لٹریچر اور اردگرد کی خبریں فراہم کرنا ——— ادب کے گرو مندروں تک شاید اس کی رسائی نہ ہو لیکن زمانہ شاہد ہے کہ اسی ھلال کی معرفت دنیائے ادب کے اُفق پر بہت سے ہلال طلوع ہوئے۔ کرنل محمد خان کے فوجی قد و قامت سے ایک ادیب کا سراغ لگانے کی ذمہ داری "ھلال" ہی پر عائد ہوتی ہے کہ اس کے ایڈیٹر کے مسلسل تقاضوں سے تنگ آکر انھوں نے "بجنگ آمد" لکھ ڈالی۔ کرنل صدیق سالک کے مقدر میں "دوزخ" کا سفر تو خیر لکھا ہی تھا، جانے سے پہلے وہ یہیں مقیم تھے اور کپتان صولت رضا کو آئی ایس پی آر والے نہ اُچک لیتے تو کاکولیات لکھنے کی بجائے وہ شاید ساری عمر توپوں کی مالش کر کے ہی گزار دیتے کہ پی ایم اے میں ان کی تربیت کے بعد فیصلہ یہی ہوا تھا کہ صولت توپ چلائے گا۔ زیرِ نظر کتاب کی اشاعت کی تہمت بھی ایڈیٹر ھلال ہی کے سر ہے۔ ہم آئی ایس پی آر میں نازل ہوئے تو اکرام قمر ایڈیٹر تھے وہ ہمیں لکھنے کی ایک راہ سُجھا گئے۔ جناب محمد یونس آئے تو بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہم سے کچھ نہ کچھ لکھواتے رہے اور یہی کچھ نہ کچھ آج زیرِ نظر کتاب کی شکل میں حاضر ہے۔ بشکریہ ہلال۔

یہاں آئی ایس پی آر کے کیمرہ مین ریاض احمد اور سابقہ فوٹوگرافر مسعود پرویز کا ذکر ضروری ہے۔ ہماری مشقِ ستم کے پہلے ٹارگٹ یہی دو حضرات تھے کہ ہم جو کچھ لکھتے اسے جبراً انھیں سنایا کرتے بحیثیت انچارج فلم اور فوٹو سیکشن کے انھیں سامعین بنانا ہم اپنا حق سمجھتے تھے لیکن جس صبر سے انھوں نے یہ اضافی ڈیوٹی انجام دی اس پر بجا طور پر وہ شکریے کے مستحق ہیں۔

۱۶ مئی ۱۹۷۹ء

اشفاق حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"جنٹلمین بسم اللہ" لکھ کر ہم نے اردو ادب کی شگفتہ تحریروں میں جو نئے گُل کھلائے تھے اور صحافتی حلقوں کی طرف سے جنھیں متبسم اضافوں کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے لیے بجا طور پر ہم شکریے کے مستحق تھے اور یہ شکریہ قارئین کے دھنک رنگ خطوط، اخباروں اور ادبی رسائل میں تیکھے تبصروں اور دوستوں کی چھوٹی پکی تنقید کی شکل میں وصول ہوا۔ اس سب کچھ کے باوجود اس کے چوتھے ایڈیشن کی نوبت آگئی ہے حالانکہ پہلے ایڈیشن کی اشاعت ہی پر کچھ دوستوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اس کا دیباچہ کسی بڑے ادیب سے لکھواؤ۔ شروع شروع کی بات تھی۔ ہمیں ان کی باتوں میں وزن محسوس ہوا۔ ایک دو بڑے ادیبوں کا کھوج لگایا اور پھر اس کے باوجود کہ بہت عرصے سے ہمارے ادب میں دیباچہ یا تبصرہ لکھنے کے لیے اصل کتاب کے مسودے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی مصنف کے نام اور اس کے اصل کام کی بنیاد ہی پر یہ فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ تبصرہ کس قسم کا ہو۔ ہم نے کتاب کے چیدہ چیدہ حصوں کا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا تب ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ بڑے ادیب تو لکھنے میں بڑا وقت لگاتے ہیں۔ جب تک ہمیں یہ چند سطری دیباچے یا تبصرے وصول ہوتے سلیمانی صاحب نے بڑی تگ و دَو کے بعد کتاب کے لیے جو کاغذ فراہم کیا تھا، گل چکا ہوتا، جو دو چار بُک سیلر کتاب کی نکاسی کے لیے تعاون پر آمادہ ہوتے تھے مُکر گئے ہوتے اور ادب کے شیدائی جن اِکے دُکے طلبہ کو ہم نے پُرزور گفتگوؤں کے ذریعے آنے والی کتاب کی خریداری کے لیے تیار کر رکھا تھا، ادب کی دُنیا

میں ہونے والے اس دھماکے کے بارے میں مایوس ہو گئے ہوتے اور اپنا بچا کھچا جیب خرچ گھٹیا کتابوں کی خریداری پر صرف کر ڈالتے ادھر ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ" تھی۔

اُردو ادب میں اِس کتاب کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی اور اس کمی کو دُور کرنے کی تمام تر ذمہ داری ہم اپنے شانوں پر محسوس کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ جہاں اتنی خوبصورت کتاب لکھی ہے وہاں ایک مختصر سا دیباچہ بھی خود ہی تحریر فرمائیں۔

الحمدللہ کہ کتاب کے ساتھ ساتھ قارئین کو دیباچہ بھی پسند آیا۔

ایک دو تبصرہ نگاروں نے تو بطورِ خاص دیباچے کی خوبصورتی کا ذکر کیا۔ اس پسندیدگی کے پیشِ نظر 'جنٹلمین بسم اللہ' کے چوتھے ایڈیشن کے اس پُرمبارک موقع پر ہم یہ دیباچہ مزید لکھ رہے ہیں تاکہ سند رہے اور مطبوعہ اوراق کی تعداد بڑھ جانے کی شکل میں سلیمانی صاحب کو کتاب کی قیمت بڑھانے کا ایک جائز سا جواز مِل سکے ورنہ کاغذ کے قیمت کی گرانی اور چھپائی کے اخراجات بڑھ جانے جیسے عذر ہائے لنگ تو آپ جانیں ناشران کے پاس ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔

والسلام

میجر اشفاق حسین

سکول آف آرمی ایجوکیشن

اپر ٹوپہ —— مری

۱۵ر مئی ۱۹۸۵ء

پہلی ملاقات

"مسلح افواجِ پاکستان آپ کے لیے چشم براہ ہیں"۔

"فوج کو آپ ایسے مستعد نوجوانوں کی ضرورت ہے"۔

"اگر کچھ کر گزرنے کی تمنائیں دل میں مچلتی ہیں تو آپ کا مقام فوج کے اندر ہے"۔

صاحبو! ایک وقت تھا جب نظر سے گزرنے والا ہر ایسا اشتہار ہم سے کچھ کہتا سنتا محسوس ہوتا۔ کھیلنے کھانے کے دن ہوں تو سُنی اَن سُنی کرنا معمول کی بات ہے لیکن مسلح افواج کا سارے کام چھوڑ چھاڑ کر ہمارے لیے چشم براہ ہونا اور ذہانت و مستعدی کے نام پر بار بار ہمیں پکارنا اتنی معمولی بات نہ تھی جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ ہم نے اس والہانہ پکار کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ متعلقہ فارم منگوائے لیکن انہیں پُر کرنے بیٹھے تو محسوس ہوا کہ اس سے کہیں زیادہ آسان کام تو اپنی سوانح عمری لکھ ڈالنا ہے۔ اتنے بہت سے فارم، ہر صفحے پر بے شمار کالم اور ہر کالم میں قطار در قطار خانے۔ مقصد ان سب کا نہایت باریکی سے ہمارے بچپن کے حالات سے اب تک کے واقعات جاننا تھا۔ تفصیلات تو بے شمار تھیں مختصراً یوں سمجھیے ہم نے لکھا ؎

تیرے بنا جو عمر بتائی بیت گئی
اب اِس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

درخواست دائر کرنے کے کافی دن بعد کی بات ہے کہ ایک نامہ جی ایچ کیو سے ہمارے نام آیا۔ مضمون اس کا کچھ اس طرح کا تھا کہ اپنی خدمات فوج کے لیے وقف کرنے کا شکریہ لیکن فلاں تاریخ کو فلاں جگہ ہمارے نمائندوں سے مل لیجیے۔ یہ گویا ابتدائی مذاکرات

(Preliminary Interview) کی دعوت تھی جو ہم نے خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔

ان مذاکرات کا دعوت نامہ اگرچہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن پھر بھی ؎

بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

کچھ لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبائیں، کچھ نے نصیحتوں سے نوازا۔ ایسے لوگ بھی ملے جو ان مرحلوں سے بار بار گزرے تھے اور بقول ان کے بالآخر انھیں منتخب تو کر لیا گیا تھا لیکن پھر ان کا فوج سے جی کھٹا ہو گیا تھا۔ یہ انھوں نے نہیں بتایا کہ جی کھٹا، کھٹے انگوروں کی وجہ سے ہوا تھا یا کسی اور وجہ سے تاہم ہمیں نادر مشوروں سے نوازنے میں انھوں نے کوئی کمی نہ کی۔

ایک صاحب نے بتایا: "پہلی دفعہ کی بات ہے میں کمرے میں داخل ہوا تو ایک قلم فرش پر پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا، یہ قلم اٹھا دیجیے۔ میں نے قلم اٹھا کر انھیں دے دیا۔ انھوں نے مجھے واپس کر دیا کہ آپ افسر نہیں بن سکتے۔"

مزید تفصیلات پوچھیں تو انھوں نے بتایا "ایسی حالت میں قلم نہیں اٹھانا چاہیے چپڑاسی کو بلا کر اس سے اٹھوانا چاہیے۔ افسر بھی کہیں خود گرے ہوئے قلم اٹھاتے ہیں۔"

ایک اور صاحب نے اس کے بالکل برعکس کہانی سنائی۔ قلم انھیں بھی فرش پر پڑا ملا تھا لیکن کسی نے انھیں قلم اٹھانے کے لیے نہیں کہا، نہ انھوں نے خود کوئی توجہ دی۔ بس اسی وجہ سے رہ گئے ـــــ ہم نے وضاحت چاہی تو بتایا کہ ہمارے قلم نہ اٹھانے کا مطلب یہ تھا کہ ہماری قوتِ مشاہدہ بڑی کمزور ہے۔

ایک صاحب نے اپنا تجربہ بتایا: "میں انٹرویو کے لیے گیا تو انھوں نے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں بے دھڑک بیٹھ گیا اور ...... فرش پر آن رہا کیونکہ کرسی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہمیں فوج کی کسمپرسی اور غربت پر رونا آیا کہ امیدواروں کے لیے انھیں دو چار اچھی کرسیاں بھی نہیں مل سکی تھیں۔ ہم ان کے ساتھ اظہارِ افسوس کرنے ہی والے تھے کہ انھوں نے وضاحت پیش کی: "کرسی پر بیٹھنا بھی تو امتحان میں شامل ہے اس کا معائنہ کرنا چاہیے۔ بغیر معائنہ کیے بیٹھنے کا مطلب ہے کہ آپ لاپرواہ ہیں اور لاپرواہ لوگ

کے لیے فوج میں کوئی جگہ نہیں۔"

اس طرح کی بہت سی داستانیں سنتے سنتے بالآخر انٹرویو کا دن آ پہنچا۔ صبح کا سہانا وقت تھا جب ہم خراماں خراماں گنگناتے ہوئے اس عمارت میں پہنچے جہاں انٹرویو منعقد ہونا تھے۔ ایک بڑے سے ہال میں بہت سے امیدوار جمع تھے۔ تیز تیز باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن جونہی ہم دروازے پر پہنچے ہال میں ایک خاموشی چھا گئی۔ کچھ گھبراہٹ سی ہوئی لیکن پھر اطمینان سے ہم نے ایک نشست سنبھال لی۔ وہاں بیٹھ کر معلوم ہوا کہ لوگ کسی افسر کے منتظر ہیں جو انٹرویو کے آغاز کا اعلان کرے۔ ہم بھی شاملِ منتظرین ہو گئے۔

پھر ؎

ہر اک آہٹ پہ ہم سمجھے
کہ شاید اب وہ آتے ہیں

لیکن پھر انکشاف ہوتا کہ یہ "وہ" نہیں ہیں "یہ" ہیں جو ہمارے ہی درمیان آ کر بیٹھ گئے ہیں۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں تو ایک ایک امیدوار کو بلایا جانے لگا۔ حکم یہ تھا کہ انٹرویو کے بعد امیدوار ہال میں واپس نہ آئیں بلکہ ایک اور سبزہ زار میں انتظار فرمائیں۔ اب ہوتا یوں کہ اندر سے جونہی کوئی امیدوار برآمد ہوتا اسے گھیر لیا جاتا، "کیا پوچھا تھا؟" "کیوں پوچھا تھا؟" "کیسے پوچھا تھا؟" وہ کچھ جواب دینے کی کوشش کرتا تو سوالات میں اور اضافہ ہو جاتا، تب وہ لب ہلاتا، بڑبڑاتا اور کھسکتا ہوا یوں سبزہ زار کی طرف بڑھ جاتا جیسے ؎

کالج سے گھر کو لوٹ رہا ہو اک بے وفا

ہماری باری بھی آ ہی گئی۔ نام پکارا گیا تو وہ ساری کہانیاں جو ہمیں سنائی گئی تھیں بیک وقت یاد آ گئیں۔ انھیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم متعلقہ کمرے میں داخل ہوئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نظروں نے فرش کا جائزہ لیا۔ "کہیں کوئی گرا پڑا قلم تو نہیں؟" خوشی ہوئی کہ فرش صاف تھا لیکن یہ خوشی فوراً کافور ہو گئی۔ نظریں جلی ہوئی ایک دیا سلائی سے جا ٹکرائی تھیں۔ پہلے سوچا کہ اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں۔ ہمارے

جسے ہمیں نفاست پسند ہونے کا احساس تو ہو گا بورڈ کو ـــــ لیکن پھر ذہن میں ایک تنبیہ اُبھری" خاکروب ذہنیت کا لیبل بھی تو چپکایا جا سکتا ہے اِس حرکت پر۔"

سو قارئین کرام! دیا سلائی بے چاری جہاں پڑی تھی، وہیں پڑی رہی اور ہم اس بورڈ کی طرف بڑھ گئے جو اُمیدواروں سے انٹرویو کے معرکے سر کر رہا تھا۔ بہت نیاز مندی سے سلام پیش کیا، جواب میں تشریف رکھنے کو کہا گیا۔ ہم نے کرسی کی جانب دیکھا اور خوف کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ کرسی پر ایک گدی رکھی ہوئی تھی۔ یا الٰہی کرسی سلامت ہی ہو۔ کرسی کا معائنہ کرنے کی حرکت کچھ غیر پارلیمانی سی لگی اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پر براجمان ہو گئے۔ کرسی سلامت تھی!

ابھی ہم خود کو کسی نہایت ہی عالمانہ قسم کے سوالات کے لیے تیار کر رہے تھے کہ پہلا سوال آیا:

"آپ کا نام اشفاق ہے؟"

"جی! یس سر!" جواب خود بخود ہونٹوں سے پھسل گیا اور پھر اچانک دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میرا نام تو اشفاق حسین ہے جواب ادھورا رہ گیا؟

ابھی ہم خود کو پریشان کرنے کی کوشش ہی میں مصروف تھے کہ سوال ہوا:

"ایم اے ہیں آپ؟"

"جی!"

"کیا مضامین رہے ہیں زیرِ مطالعہ؟"

اس طرح کے چند بے ضرر سے سوال ہوتے رہے۔ سُنی سُنائی روایات سب جھوٹی نظر آ رہی تھیں کہ اچانک سوال آیا۔

"بھئی یہ جوزف فارلینڈ ایران میں کیا کر رہے ہیں؟"

"جی فارلینڈ ـــــ؟"

"جی ہاں جی، یہ فارلینڈ!"

"معاف کیجیے۔ میں ان کا رشتہ دار، نہ پرسنل سیکرٹری، مجھے کیا معلوم!"

ایک مختصر سا قہقہہ بلند ہوا لیکن اصرار جاری رہا کہ بتائیے فارلینڈ ایران میں کیا کر رہے ہیں۔ موصوف کبھی پاکستان میں امریکہ کے سفیر رہے ہیں۔ اتنا تو ہمیں معلوم تھا لیکن ان دنوں وہ ایران پہنچے ہوئے تھے۔ یہ ہمیں بورڈ کی زبانی ہی معلوم ہوا۔ وہ وہاں کیا کر رہے تھے جانے بورڈ کے ارکان کو اس سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بڑی مشکلوں سے انھیں یہ یقین دلایا کہ بین الاقوامی معاملات میں محترم فارلینڈ کی اہمیت اگر ہے تو بس اتنی ہی کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ وہ آج کل کہاں ہیں۔ انھیں اس سے زیادہ اہمیت دینا سراسر زیادتی ہے۔ غالباً ہماری بات مان لی گئی۔ سوال آیا۔

"آپ جغرافیہ کے طالب علم رہے ہیں؟"

"جی" (جی خوش ہوا کہ مطلب کے مضمون پر آ رہے ہیں)

"اچھا! سورۂ عصر کا ترجمہ سنائیے۔"

ذہن جو دُنیا کے نقشے کو ترتیب دینے میں مصروف تھا یکدم پلٹ ہو گیا۔ سوال سمجھ میں تو آ گیا تھا لیکن شک ہوا کہ جغرافیہ کے ناطے سے سورۂ عصر کا ترجمہ نہیں مقام نزول پوچھ رہے ہوں گے۔ سو جواب تھا۔

"مکی سورت ہے۔"

"بالکل درست۔ اب ترجمہ بھی ارشاد فرمائیے نا!"

ہم نے ترجمہ ارشاد فرمایا کہ کچھ بے لوث بزرگ زورا زوری ہمیں تھوڑی بہت عربی سکھانے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے۔

اب خیال تھا کہ اسلام کے موضوع پر کوئی بات چیت ہو گی سو ذہن میں قرآنی آیات اُبھرنے لگیں۔ صحابہؓ کا ذکر یاد آنے لگا اور ہم حضورؐ کی مکی و مدنی زندگی کے مشہور واقعات یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے لیکن سوال آیا:

"انڈونیشیا کی مشہور پیداوار کیا ہے؟"

پہلے تو سخت غصہ آیا کہ کیا اُوٹ پٹانگ سوالات پوچھ رہے ہیں۔ جی میں آیا پوچھوں کہ کھیل صاحب یہی سکھایا گیا ہے آپ کو فوج میں؟ نظم و ضبط سے یہی ذہنیت تکمیل ہوئی

ہے آپ کی؟ ترتیب نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے! ذرا سلیقے سے سوال کیجیے نا!

ایک صاحب نے کہ ماہرِ نفسیات دکھائی پڑتے تھے غالباً ہمارے خیالات پڑھ لیے بولے، "شاید آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

کہنا تو ہم بہت کچھ چاہتے تھے لیکن صرف اتنا کہا اور وہ بھی دل میں ؎

گماں نہ کر کہ مجھے مجالِ سوال نہیں
فقط یہ ڈر ہے تجھے لاجواب کر دوں گا

سو بورڈ کے معزز ارکان ہم سے یہی سلوک کرتے رہے کہ ذرا چٹ پٹی چیز و لوگوں کا اور سوال آیا، "کیوں جی اسلام علمِ نجوم کے بارے میں کیا کہتا ہے؟" بات ہوتی بین الاقوامی معاملات میں بڑی طاقتوں کے کردار کی کہ کوئی صاحب پوچھتے "ممبئی آپ کے ڈیڈی اور ممی میں لڑائی ہوتی ہے؟"

ہم بہت جلد ہی سمجھ گئے، علم سے زیادہ یہ اعصاب کا امتحان ہے (جو اس وقت خاصے مضبوط واقع ہوئے تھے)

آخر کار ہمارے نام الاٹ سوالوں کا کوٹہ ختم ہوا اور ہمیں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ ہم نے نہایت سعادت مندی سے سلام عرض کیا اور رخصت ہوئے۔

یہ تھی فوج سے ہماری پہلی ملاقات جس کے نتیجے میں قائم ہونے والی شناسائی ابھی تک جاری ہے اور اس شناسائی کے حوالے سے ہم اس بات کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ فوج میں آنے والوں کو نیم حکیم جیسے مشورہ فرمانے والوں سے بچ جانے کی تلقین فرمائیں۔ سوائے وہ لوگ کہ جنھیں اپنے شانوں پر ستاروں کی جگمگاہٹ عزیز ہے ہماری بات غور سے سنو۔ فوج کو سیدھے سادے عام سے انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بس۔ آئندہ آپ کو کبھی فوج سے بلاوا آئے تو یقین رکھنا انٹرویو لینے والے حضرات زیادہ سے زیادہ لوگوں کو منتخب کرنا چاہتے ہیں بھلے مانس لوگوں کو مسترد کرنے کی کوئی ہدایت انھیں کہیں سے وصول نہیں ہوتی۔ پھر ان کے سامنے جانے کے لیے علم کے کسی بحرِ ذخار میں غوطے لگا لگا کر پہلے سے موجود معلومات کو دریا برد کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جو کچھ ہیں وہ بنے رہیے۔ دم پخت آپ کو فوج خود کر لے گی۔

بورڈ یاترا

آئی ایس ایس بی کی کال آنے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ ایک دن دوستوں کی محفل برپا تھی۔ خوش گپیاں جاری تھیں کہ کسی نے ہمارے بارے میں انکشاف فرمایا کہ امیدوار کمیشن ہیں، ابتدائی انٹرویو دے چکے اور اب کوہاٹ جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ کیوں؟ کب؟ کیسے اور کس لیے جیسے ہر قسم کے بہت سے سوالات بیک وقت ہم پر برسے۔ یار لوگوں نے انٹرویو سے لے کر میڈیکل ٹیسٹ تک کی شرم انگیز تفصیلات مزے لے لے کر سنیں اور جب تجسس کی بے چینیاں کچھ کم ہوئیں تو ایک بزرگ دوست کہ جن سے ملاقات کا شرف پہلی بار حاصل ہو رہا تھا، بڑے وثوق سے یہ فیصلہ صادر فرمایا:

"آپ نہیں سلیکٹ ہو سکتے، جناب والا!"

اور حیرت سے ہمارا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہ سلیکشن بورڈ کے یہ خود ساختہ رکن یہاں کہاں ٹپک پڑے اور قبل از وقت فیصلہ کیوں کر سنا دیا ہے۔ انھوں نے تحقیق پر دریافت ہوا کہ موصوف دو بار کوہاٹ کا سفر اختیار کر چکے ہیں اور تیسری بار کا یارا نہیں۔

(آئی ایس ایس بی میں دو بار ناکام ہونے والے کمیشن کے لیے مزید درخواست دینے کے اہل نہیں رہتے۔)

ہم نے بہتیرا اصرار ان سے یہ دریافت کرنے میں کہ وہ کوئی ایک ایسی علامت بتا دیں جو ہمارے چہرے پر ناکامی کا مظہر بنی ہوئی ہو لیکن ان کا فیصلہ تو الہامی تھا۔ بڑے اصرار کے بعد انھوں نے پوچھا:

"سفارش ہے کسی جنرل کی آپ کے پاس؟"

نفی میں جواب پا کر بولے:

"پھر تو بہت مشکل ہے۔ جنرل سے نیچے تو کسی کی سنتے ہی نہیں وہ!"

ایک بار تو دلِ ناتواں نے یقین کر لینا چاہا کہ چلو ختم کریں یہ جنجال۔ کسی جنرل تک رسائی کیونکر ہوگی! لیکن پھر خیال آیا کہ یہ جو فوج میں چوڑے چکلے سینوں والے جوان اتنے بہت سے افسر ہیں سب جنرلوں کے بھانجے بھتیجے ہیں کیا؟

یُمنہ اور سُور کی وال وال ان کیفیات سے ہمیں کئی بار گزرنا پڑا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی یہاں تک کہ کوہاٹ کے لیے قیامت کا ایک نامہ ہمارے نام آیا۔

ہمارے ہاں عام طور پر دعوت ناموں میں لباس کے بارے میں وضاحت کر دی جاتی ہے۔ سردی ہو یا گرمی سوٹ ہونا لازمی ٹھہرا ہے۔ بند کالروں سے کم پر تو کوئی تقریب منعقد ہو ہی نہیں سکتی لیکن یہ عجیب دعوت نامہ تھا کہ لباس کی مد میں نیکروں اور بنیانوں پر زور دیا گیا تھا۔ ہم نے اسے غور سے پڑھا اور بار بار پڑھا پھر سر کو کھجاتے ہوئے مطلوبہ اشیاء خرید ڈالیں اور عازمِ کوہاٹ ہوئے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ تمام تانگے والوں کو ہمارے آنے کی پیشگی اطلاع پہنچائی جا چکی ہے کہ اڈے پر اترتے ہی بغیر ہم سے پوچھے گچھے بہت سے کوچوان ہمارے سوٹ کیس پر لپکے اور ہمیں اپنے اپنے تانگوں میں بیٹھنے کو کہا۔ صورت یہ ہوئی کہ ہم ایک تانگے میں بیٹھے ہیں اور سوٹ کیس دوسرے تانگے میں پڑا ہے۔ دونوں کوچوانوں کے درمیان مذاکرات جاری ہیں۔ ایک صاحب ہمارے سوٹ کیس سے محروم ہونا نہیں چاہتے تو دوسرے کو ہماری جدائی گوارا نہیں۔ محبت کے ان مناظر سے ہم بہت متاثر ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ آبدیدہ ہو کر دونوں کو گلے لگاتے ایک تیسرا کوچوان چشم زدن میں دوسرے تانگے سے ہمارا سوٹ کیس اٹھا لایا ہم اس کی طرف لپکے اور اس نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ اس طرح ہمارا تانگے کی سلیکشن کا معاملہ طے ہو گیا۔

بس سٹینڈ سے تانگہ ہمیں لے کر آئی ایس ایس بی...... پہنچا تو معلوم ہوا کہ دیر سے پہنچنا تو پابندیٔ وقت کی خلاف ورزی کہلاتا ہی ہے یہاں وقت سے پہلے پہنچنا بھی اسی زمرے میں شامل ہے۔ بورڈ والے امیدواروں کو بتائے گئے وقت پر ہی "وصول" کرتے ہیں۔ چار بجنے میں ابھی دیر تھی۔ امیدوار آتے سامان گیٹ کے پاس دھرتے سوالیہ نظروں سے

دوسرے امیدواروں کا جائزہ لیتے اور انتظار کی گھڑیاں گننے لگتے۔

بالآخر گیٹ کھلا اور تمام امیدوار اپنا ساز و سامان اٹھائے لٹے ہوئے قافلے کی سی صورت آئی ایس ایس بی کی عمارت میں داخل ہوتے اور پناہ گزینوں کی طرح برآمدوں میں ڈیرے ڈال دیے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ ایک صاحب کہ اپنی شفقتوں کے ناطے کسی ریلیف ٹرسٹ کے نمائندے معلوم ہوتے تھے آئے اور باآواز بلند کمروں کی الاٹمنٹ شروع کر دی۔ سامان کمروں میں رکھنے کے بعد ایک ہال میں جمع ہونے کے لیے کہا گیا جہاں گرم گرم سموسوں اور چائے سے ہماری تواضع کی گئی۔ چائے کے ساتھ ساتھ حاضری بھی ہوتی اور پھر ہر امیدوار کو ایک ایک کر کے ایک کمرے میں بھیجا گیا۔ اس کمرے میں جو داخل ہوتا واپس نہ آتا۔ ہم حیران کہ اس کے اندر کیا کرشمہ سازی پنہاں ہے۔ ہماری باری آئی۔ ابھی کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ کسی نے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے گلے میں ڈال دی جیسے پھولوں کے ہار پہناتے ہیں۔ ہم نے نگاہ اٹھائی تو ایک فوٹوگرافر کو منتظر پایا۔ ابھی ہم مسکرانے اور پوز بنانے کی ابتدائی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ اس نے کھٹ سے ہماری تصویر اتار ڈالی اور شکریہ کہہ کر باہر کا راستہ دکھایا۔

اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

باہر آئے تو معلوم ہوا کہ بس آج کی کارروائی اتنی ہی تھی باقی کل۔ لیکن تصویر یہ معلوم ہوا کہ راتوں رات تمام امیدواروں کی تصویریں بنا کر ان تمام حضرات کے حوالے کر دی جائیں گی جو آئندہ تین دنوں میں امیدواروں کا جائزہ لینے والے تھے۔ اور یہ گلے میں ڈالی جانے والی چیز جو ابھی تک ہماری زیبِ گلو تھی۔ کپڑے کی ایپرن ٹائپ کوئی چیز تھی جس پر ہمارا نمبر لکھا تھا جس سے آئندہ تین روز تک ہمیں پکارا جانا تھا۔

واپس کمرے میں آئے تو باقی حضرات کو بستروں پر با جماعت کتابوں کے مطالعے میں غرق پایا۔ تھوڑی سی تفتیش کے بعد انکشاف ہوا کہ آئی ایس ایس بی کے مرحلوں میں رہنمائی کے لیے بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ ہم نے عاریتاً کسی سے کتاب لی اور الٹ پلٹ کر دیکھا ذہن منتشر ہو گیا۔ اتنی موٹی کتاب تو ہم اپنی پوری تعلیمی زندگی کے دوران ختم نہیں کر سکے تھے

"جی ___ ؟ کُو پانچ روپے کا!"

اور ممتحن نے جو خود بھی سگریٹ پی رہے تھے، پیکٹ نکال کر سامنے رکھ دیا کہ پڑھیں اس پر کیا قیمت لکھی ہوئی ہے۔ یہ قیمت بتائی گئی قیمت سے خاصی مختلف تھی۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے ان امیدواروں کی ذہنیت بھی جا سکتی ہے جو یا تو خواہ مخواہ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں یا بغیر کچھ سوچے سمجھے چھوٹے موٹے جھوٹ بول جاتے ہیں جو نبھائے جاتے نہیں اور پھر ان کے ذہن انہی میں اُلجھے رہتے ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم وہاں کی ابتدائی کارروائیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ ابتدا یوں ہوئی کہ تمام امیدواروں کو آٹھ آٹھ دس دس کے گروپوں میں بانٹ دیا گیا۔ سب سے پہلے ہر گروپ کو نیم دائرے کی شکل میں بٹھا کر ایک موضوع دیا گیا، سوچنے کا وقت بھی اور پھر امیدواروں سے اس پر اظہارِ خیال کو کہا گیا۔ پندرہ منٹ بعد کوئی اور موضوع دیا گیا۔ پہلا موضوع تو ہمیں یاد نہیں رہا۔ دوسرا کچھ یوں تھا:

"مزدوروں میں بے چینی کا ذمہ دار کون ہے؟ مزدور، سرمایہ دار یا حکومت؟"

صورتِ حال یہ تھی کہ جونہی بولنے کا اشارہ ملا، ہر امیدوار پہل کی کوشش کرتا اور ایک بار شروع ہوتا تو بولتا چلا جاتا۔ جوں ہی اس کی آواز دھیمی ہوتی کوئی اور صاحب بولنا شروع کر دیتے۔ ہر شخص کو بولنے سے دلچسپی تھی سننے کا یارا کسی میں نہ تھا۔ ایک موقع ہمارے ہاتھ آیا تو ہم نے بھی بولنا شروع کر دیا۔

"مزدور تو بے چارہ غریب ہوتا ہے۔ ایک وقت کی مزدوری نہ ملے تو اس کے گھر میں چولہا نہیں جل پاتا اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مزدوروں میں بے چینی پھیلائے کا سراسر زیادتی ہے۔"

"سرمایہ دار کا سارا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ اس کے کارخانوں میں کام جاری رہے وہ تو مزدوروں میں بے چینی پھیلانے سے رہا۔"

"مزدوروں میں بے چینی پھیل ہی جائے تو دردِ سری تو حکومت کی ہوتی ہے اور کوئی حکومت جان بوجھ کر اپنے بجٹ میں اسپرین جیسی دوائیوں کا بوجھ بڑھانا نہیں چاہتی۔

چنانچہ مزدوروں میں بے چینی کا ذمہ دار نہ مزدور ہے نہ سرمایہ دار اور نہ حکومت؟"

ممتحن جو وہاں جی ٹی او (گروپ ٹیسٹنگ آفیسر) کہلاتے ہیں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، "تو پھر اس بے چینی کا ذمہ دار ہے کون؟"

"ہاں! کون ہے! کون ہے ابھی کچھ آپ بھی بولیں کہ کون ہے؟"

ہم نے اپنے گروپ کے دوسرے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور بہت سے لوگ بیک وقت موضوع پر چل پڑے۔ اس بحث کے آخر میں رائے شماری نہیں ہو پائی تھی ورنہ آج ہم آپ کو ضرور بتاتے کہ مزدوروں میں بے چینی کا ذمہ دار کون ہے۔ تاہم بعد میں ہمارے جی ٹی او نے ہمیں ایک طرف لے جا کر یہ ضرور پوچھا تھا کہ ہم نے کس سیاستدان کی شاگردی اختیار کر رکھی ہے۔

اس بحث و تمحیص کے بعد ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں ایک میز پر ایک ماڈل بنا ہوا تھا۔ سمندر، اس کے کنارے پر ایک قلعہ، جہاز اور کشتیاں وغیرہ۔ جی ٹی او نے ایک تصویر کھینچی، کچھ لوگ جہاز میں کہیں جا رہے ہیں۔ راستے میں انہیں طوفان نے آ لیا۔ قلعے سے کمک پہنچائی ہے لیکن کشتیاں ہیں تھوڑی آدمی ہیں زیادہ۔ ہم نے پوچھا:

"کتنے آدمی زیادہ ہیں؟"

"پانچ" جواب ملا۔

ہم نے کہا "ان پانچ کو ضرور سزا ملنی چاہیے۔"

"کس بات کی؟"

"خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کرنے کی۔"

جی ٹی او مسکرائے لیکن بولے کہ سزا بعد میں دے لیں گے، فی الحال انہیں ساحل پر لاؤ۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک ہم سمندر کے پانیوں پر غور کرتے رہے لیکن کبھی طوفان میں گھرے آدمی ساحل پر پہنچ جاتے تھے تو امدادی پارٹی تباہ شدہ جہاز کے ساتھ ہی غرق ہوتی دکھائی دیتی۔ امدادی پارٹی کو بچاتے تو مسافروں کو ڈوبنا پڑتا تھا۔ جب وقت ختم ہوا تو امدادی پارٹی اور مسافر سب کے سب غوطے لگا رہے تھے۔ ہم نے انہیں ان کے

حال پر چھوڑا اور ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ دوسرے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک سنڈیکیٹ کسی جنگل سے گزرتے قافلے کو ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا ہے۔ کچھ مسافروں کو شیروں نے پھاڑ کھایا۔ کچھ دلدلوں میں پھنس گئے۔ ایک اور سنڈیکیٹ ایک صحرا میں گرے ہوئے تباہ جہاز کے مسافروں کے لیے نرسوں اور ڈاکٹروں کا بندوبست نہ کر سکا۔ ہم نے ان تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی اور اس افسر کی طرف متوجہ ہو گئے جو آئندہ مرحلے کے لیے ہدایات دے رہے تھے۔

آئندہ مرحلہ شروع ہوا۔ سٹیج پر ایک سکرین لگی ہوئی تھی۔ اس پر چند لمحوں کے لیے ایک لفظ ابھرتا اور مٹ جاتا۔ اُمیدواروں سے کہا گیا تھا کہ ان الفاظ کے فقرے بنائیں۔ مکمل فہرست تو ہمیں یاد نہیں دو چار لفظ یاد ہیں جنھیں ہم نے فقروں میں بدل دیا تھا۔ مثلاً: سکرین پر ابھرا:

"لڑکی"

"خوبصورت ہونی چاہیے۔" ہم نے فقرہ مکمل کر دیا۔

"رات" نیا لفظ آیا۔

"برسات کی ہو" ہم نے خواہش ظاہر کی۔

"پاسبان"

"کوئی نہ ہو!"

"زندگی"

"نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔"

"شمع"

"ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔"

وغیرہ وغیرہ۔

اکثر ایسا ہوا کہ ہم ایک فقرہ مکمل کر رہے ہوتے اور سکرین پر الفاظ کھٹا کھٹ گزرتے رہتے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ الفاظ چھوٹنے کی فکر نہ کی جائے۔ چنانچہ ہم بے فکر ہو کے کھیل

ختم ہوا۔ پرچے لے لیے گئے اور تھوڑی دیر بعد اب تک کے مرحلوں کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ ناکام ہونے والوں سے بڑے ادب سے درخواست کی گئی کہ وہ رخصت ہو سکتے ہیں۔ گیٹ سے باہر تانگے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ "شہر، شہر۔ چلو باؤجی جلدی چلیں۔ شہر شہر۔"

ہال کے سناٹوں میں باقی رہ جانے والوں میں ہم بھی تھے۔ ہمیں مزید امتحانات سے گزارا گیا۔ کبھی پندرہ بیس سیکنڈ کے لیے کوئی تصویر دکھائی گئی اور اس پر ایک مضمون لکھنے کو کہا گیا۔ کبھی مختلف رسالے ہمارے حوالے کیے گئے جن میں درج مختلف سوالوں کے جواب ہاں یا نہیں میں دینے تھے۔

بحث و تمحیص، مذاکرات، انٹرویو اور دیگر امتحانات کا یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہا۔ پھر اُمیدواروں کو بتایا گیا کہ وہ کل صبح تک کے لیے آزاد ہیں۔ شہر جائیں، فلم اڑائیں یا کمروں میں رہ کر اودھم مچائیں، کوئی پابندی نہیں۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ صبح سے اب تک ذہن میں جو تھوڑی بہت کشیدگی سی پیدا ہو چکی تھی اسے جھٹک، ہلکے پھلکے سے ہو میس میں پہنچے۔ کھانا کھاتے ہوئے ویٹروں کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ ہر سال سیکڑوں اُمیدواروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ آئی ایس ایس بی کی تاریخ ان کے سینوں میں دبی پڑی ہے۔ جانے کیسے کیسے اُمیدوار یہاں آتے ہوں گے۔ ان سے کچھ پوچھا تو جائے۔ ہم نے پاس کھڑے ویٹر کو قریب بلایا:

"کیوں بھئی، کب سے ہو تم یہاں؟"

جانے اُس نے کیا کہا لیکن ہمیں دوسرا سوال کرنے کی ابھی نوبت ہی نہ آئی تھی کہ ہمارے ساتھ بیٹھے ایک اُمیدوار نے کہ کسی اُونچے گھر کے فرزند لگتے تھے سرگوشی میں ہمیں ڈانٹ پلائی۔

"ان ملازموں کو منہ نہیں لگایا کرتے۔"

ہم نے صرف گھور کر انھیں دیکھا اور دوبارہ ویٹر کی طرف متوجہ ہوتے۔ انھیں ڈانٹ ضائع ہوتی نظر آئی تو نصیحت پر اُتر آئے۔

"یہ رپورٹ کر دیتے ہیں کہ فلاں صاحب ہم سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے نہیں رکھتے پھر وہ!"

ملازموں سے بات کرنا ہی ڈِس کوالیفائی ہونے کے لیے کافی ہے؟ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم نے سر جھکایا اور خاموشی سے کھانا ختم کیا۔

یہاں قدم قدم پر ان ناصحین سے پالا پڑتا تھا جو پہلے بھی ایک بار "بورڈ پار" کر چکے تھے اور سابقہ تجربوں کی بنا پر "مشوروں اور نصیحتوں" سے لبریز تھے اور موقع پاتے ہی ان مشوروں کے جام نئے اور اجنبی امیدواروں پر لنڈھانا باعثِ ثواب سمجھتے تھے۔ ہم نے کہ ان مشوروں سے تنگ آچکے تھے، فیصلہ کیا کہ بورڈ چھوڑ کر شام شہر میں گزاری جائے۔ لیکن ابھی ہم باہر جانے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ ایک بندہ نواز اپنے مشوروں سے نوازنے آپہنچے۔ یہ جان کر کہ ہم فلم دیکھنے جا رہے ہیں کہنے لگے لال پیلے ہوتے۔

"بھئی کچھ کل کی تیاریاں کرو۔ یہ بے فکری تمھیں لے ڈوبے گی۔"

ہم نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ "بھئی ہم آکر پڑھ لیں گے۔"

یہ عزم دیکھ کر کچھ ان کی ڈھارس بھی بندھی اور وہ ہمارے ساتھ فلم پر چلنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن ان کا حال یہ تھا۔

دلوں پر اداسی، دماغوں میں الجھن، خیالوں میں تلخی، نگاہوں میں ہول

ہم نے بارہا انھیں ہنسانا چاہا لیکن انھیں رہ رہ کر بورڈ یاد آرہا تھا۔ کل کے امتحانات کا خوف ان پر سوار تھا اور راہ چلتا ہر شخص انھیں جی ٹی او (گروپ ٹیسٹنگ آفیسر) نظر آرہا تھا۔ فلم دیکھنے گئے تو انھوں نے بتایا کہ بعض سینماؤں پر گیٹ کیپر جی ٹی او ہوتے ہیں۔ وہ امیدواروں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور بورڈ کو رپورٹ بھیجتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ ہال میں داخل ہوتے ہوئے موصوف نے اپنا ٹکٹ بڑے ادب سے گیٹ کیپر کے حضور پیش کیا اور نہایت عاجزی کے ساتھ چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اور سرنگوں ہو کر ہال میں یوں داخل ہوتے جیسے فلم دیکھنے نہیں کسی زیارت پر فاتحہ خوانی کے لیے جا رہے ہوں۔

ہم نے ان سے پوچھا کہ بفرضِ محال یہ گیٹ کیپر جی ٹی او ہے بھی تو یہ بھی توقع رکھتا ہوگا کہ امیدوار گیٹ کیپروں سے گیٹ کیپروں والا سلوک کریں۔ پیری مریدی کی دکان تو نہیں سجائی جا سکتی نا یہاں آخر ———— اس بات سے وہ اور پریشان ہو گئے۔

آخری دن کی مصروفیات خاصی دلچسپ تھیں۔ ایک احاطے میں ایک گھنے درخت سے رسے لٹکائے گئے تھے۔ پہلی نظر میں تو یہیں یہ جھولے نظر آئے کہ ساون کے موسم میں ان پر جھولے لینے کو جی مچلے لیکن بتایا گیا کہ تنے کے راستے درخت کے اوپر جانا ہے اور رسوں کی مدد سے زمین پر اترنا ہے۔ بے تکا ذوق؟ چلو یہاں تک تو گوارا تھا لیکن اور کہیں کسی ٹرک کا ایکسیڈنٹ ہوا ہوگا۔ اس کے سپیئر پارٹس تو کسی نے بیچ کھائے ٹائر آئی ایس ایس بی والوں کے حصے میں آئے۔ انھوں نے ان ٹائروں کو درختوں سے لٹکا رکھا ہے۔ امیدواروں سے کہتے ہیں کہ ان ٹائروں سے گزر کر دکھاؤ تو جانیں ————

اسی احاطے میں ایک اور چیز کا نام ہے ٹارزن سوئنگ (Tarzen swing) امیدوار کو ایک اونچے سے چبوترے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور ایک رسے کی مدد سے ایک اور چبوترے تک جھولا لگانا ہوتا ہے۔ اسی طرح کے دو چار اور کرتب دکھانے ہوتے ہیں۔

آخری امتحان یہ تھا کہ تمام امیدواروں کو ایک ایک پرچی دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ اپنے اپنے گروپ میں کارکردگی کے لحاظ سے امیدواروں کو ترتیب سے لکھ دیں۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ امیدوار کا جائزہ لیا جائے کہ وہ کام کرنے والوں کی ریٹنگ کہاں تک درست کر سکتا ہے۔

لیکن ہم نے بعد میں لوگوں کو صرف اسی بات پر ایک دوسرے سے ناراض ہوتے دیکھا کہ ایک نے دوسرے کا نام سرِ فہرست کیوں نہیں لکھا تھا۔

دوپہر کے وقت فیصلے سنا دیے گئے۔ ہر گروپ اپنے اپنے جی ٹی او کے دفتر کے باہر جمع ہوا۔ ایک ایک آدمی کو بلایا جاتا۔ زیادہ تعداد ان کی تھی جنھیں کمرے میں بلا کر کہا جاتا: "ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کو سلیکٹ نہیں کر سکتے۔" ایک امیدوار بمشکل نصف منٹ کمرے میں ٹھہرتا اور ایک پروانہ ہاتھ میں لیے واپس چلا آتا۔ تین دنوں کی محنت کے فیصلے اتنے

مختصر وقت میں، نہ چیلنج کا حق، نہ بحث کی گنجائش، اور نہ استفسار کا موقع۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اور نبضیں مدھم۔ تین دنوں سے جو اعتماد قدم قدم پر رہنمائی کرتا چلا آیا تھا، آخری سلام کہہ کر رخصت ہو گیا۔ نامعلوم نتیجے کے خوف سے ایک سرد لہر سی جسم میں سرایت کر گئی۔

نظریں بار بار جی ٹی او کے دروازے کی جانب اٹھ جاتیں، جہاں امیدواروں کی "ورود و برآمد" کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْت کا محاورہ اپنی تمام تر خوفناکیوں کے ساتھ جلوہ فگن تھا۔

بالآخر ہمارا نام پکارا گیا۔ لرزتے قدموں اور دھڑکتی نبضوں کے ساتھ ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ جی ٹی او نے ہمیں دیکھا، مسکرائے (ان کی مسکراہٹ ہمیں زہر لگی) اور کچھ کہا۔ جانے کیا! اور ایک کاغذ ہمیں تھما دیا۔ ناکامی کا پروانہ سمجھ کر ہم لوٹنا چاہتے تھے کہ روک لیے گئے۔ جی ٹی او نے آئندہ کے لیے جبکہ ہم فوج میں افسر ہو جائیں گے نصیحتیں کرنا شروع کیں۔ ان باتوں سے ہمیں شک ہوا کہ ہم ناکام نہیں، کامیاب ہو گئے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے نظر بچا کر سرٹیفکیٹ دیکھا۔ اس پر کامیابی کی نوید نظر آئی اور ہم نڈھال ہو کر کرسی پر یوں بے حس ہو گئے جیسے ایک مسافر سفر کی تمام کلفتیں تو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا چلا آیا ہو لیکن منزل پر پہنچ کر اپنوں کے شفیق چہرے نظر آتے ہی تیورا کر ان کے قدموں میں گر پڑے۔

اوسان بحال ہوئے تو ہم نے جی ٹی او سے پوچھا کہ امیدواروں کی سلیکشن کے لیے آپ نے تحقیقات کے دائرے ویٹروں اور بیٹ مینوں کے گیٹ کیپروں تک کیوں پھیلا رکھے ہیں؟ انھوں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے "یہ افواہیں ہمارے علم میں ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ امیدواروں کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ ہم یہاں مناسب امیدواروں کی تلاش میں بیٹھے ہیں اور ہماری زیادہ سے زیادہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ امیدواروں کو چنا جائے۔ لیکن ہمارے بارے میں امیدواروں کی یہ رائے ہوتی ہے کہ ہم صرف انھیں ریجیکٹ کرنے کے لیے ہی برپا کیے گئے ہیں۔"

آغازِ سفر —— انجامِ تمنّا

کوہاٹ سے لوٹے دو چار روز ہی گزرے ہوں گے کہ جی ایچ کیو سے اطلاع ملی کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ہمارا ٹریننگ کورس شروع ہو چکا ہے۔ ہم فوراً سے پیشتر اکیڈمی پہنچ جائیں۔ دو ایک روز تیاریوں میں گزر گئے اور ایک دن کسی سے امام ضامن بندھوائے بغیر ہم "کاکول" روانہ ہو گئے۔

سڑک کسی حسینہ کی زلفوں کی طرح بل کھاتی نظر آتی تھی اور کھچڑی ایسے بالوں والا ڈرائیور مسافروں سے بھری بس کا تنہا ناخدا بنا، سٹیئرنگ پر بیٹھا اُڑا چلا جا رہا تھا۔ ہر قدم پر خوفناک موڑ، جن کے ایک طرف اتھاہ گہرائیاں تھیں تو دوسری طرف بلند ہوتی ہوئی سنگلاخ چٹانیں۔ ہر موڑ پر مخالف سمت سے آنے والی بسوں کا سامنا۔ قدم قدم پر موت کی دیوی لبوں پر مسکراہٹ لیے سراپا انتظار نظر آتی۔ "جل تو جلال تو" کا ورد خود بخود ہونٹوں پر جاری ہو جاتا۔ یہ ورد ڈرائیور کے کانوں میں پڑا تو اپنے "تیز رفتار کارنامے" کی داد سمجھ کر مزید "کارناموں" پر اتر آیا۔ اب ع

اپنی منزل کی طرف مائل پرواز تھی "بس"

گمان یہ ہوتا تھا کہ بس کی بجائے کسی طیارے میں بیٹھے ہیں جو مزید کچھ فٹ "ٹیکسی" کرنے کے بعد فضا میں بلند ہو جائے گا۔

نگاہیں ایک بے بسی کے عالم میں ڈرائیور کی جانب اٹھیں تو عین اس کے سر کے اوپر ایک تختی لگی نظر آئی۔ "ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے پر مجبور نہ کریں۔" ارد گرد نظر ڈالنے پر مجرم کا احساس ہوا۔ دوسرے مسافر شاید ان راہوں پر اسی رفتار کے عادی ہوں اس لیے

وُہ نہایت اطمینان سے قومی و بین الاقوامی معاملات پر گپ افشانیوں میں مصروف تھے۔ ڈرائیور کی کارکردگی کا جائزہ صرف ہم ہی لے رہے تھے جن پر اپنی "دھاک" بٹھانے کے لیے ڈرائیور گاڑی تیز چلانے پر "مجبور" ہو رہا تھا۔ سو سڑک سے توجہ ہٹانے کے لیے مسافروں کی دلچسپ گفتگو سے لُطف اندوز ہونا ایک اچھا مشغلہ نظر آیا۔

دائیں طرف بیٹھے دو حضرات یہ گتھی سلجھانا چاہتے تھے کہ آخر امریکہ اور رُوس میں چاند پر پہنچنے کی جو دوڑ لگی ہوئی ہے امریکہ نے اسے جیت کر کون سی توپ چلائی ہے؟ (آرٹس والے شاید اس کا جواب دے سکیں)

سامنے کی نشست پر براجمان دو سادہ لوح دیہاتی اِس بات پر بڑے خُوش نظر آ رہے تھے کہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ ملک معراج خالد (ذکر انہی کے وقتوں کا ہے) نے اعلان کر دیا ہے کہ آئندہ انھیں "ملک" کے نام سے نہ پکارا جائے کہ بڑائی ملک، نواب، پیرزادہ ہونے میں نہیں بلکہ "ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد" میں ہے۔ یہ سادہ دِل بچے یہ سوچ سوچ کر خُوش ہو رہے تھے کہ پنجاب کا وزیرِ اعلیٰ عنقریب ایک آرڈر جاری کر دے گا۔ پھر تمام دیہات سے ملکوں اور گُوانوں کی حکمرانی ختم ہو جائے گی اور ہر سُو چین کی بنسی بجتی نظر آئے گی۔

دُوسروں کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی بین الاقوامی معاملات پر "تدبّر" شروع کیا۔ ذہن میں یکبارگی دُنیا کا نقشہ اُبھرا اور خیالات براعظموں کو پھلانگتے، چھوٹے موٹے ملکوں کو پیچھے چھوڑتے برطانیہ پر مرکوز ہو گئے۔

"ہاں برطانیہ"

"کیپٹن فلپ اسی ملک کی فوج کا افسر ہے نا!"

"اور وُہ شہزادی این! ارے یہ اسے کیا سُوجھی! اچھی بھلی شہزادی اور ایک فوجی پر مرمٹی۔ پگلی کہیں کی!"

"چھوڑو جی! کہاں راجہ بکرماجیت اور کہاں گنگُو تیلی۔"

ابھی خیالات کا یہ یک طرفہ مکالمہ یہیں تک پہنچا تھا کہ ذہن نے تنبیہ کی کہ دیکھو

عنقریب تم بھی شانوں پر چمکتے دمکتے پھُول لگائے افسروں کی صف میں جا شامل ہو گے۔ خود کو وردی میں ملبُوس دیکھا تو ایک عجیب کیف سا طاری ہو گیا۔ دو چار شعر بھی سرزد ہو گئے ؎

بے نام سی یہ اِک وردی ہے
پر اتنی ہم کو سجتی ہے
شہزادے سے ہم لگتے ہیں
ہر لڑکی ہم پہ مرتی ہے!

شعر تو افسر بننے کے بعد بھی وارد ہوتے رہے ہم پر لیکن اُن میں احساسات کا رنگ ذرا مختلف ہے۔ حال ہی میں اپنی زبوں حالی پر ہم نے ایک طویل نظم لکھی جس کا ہر بند اِس مصرع پر ٹُوٹتا تھا ؎ ہر لڑکی ہم سے ڈرتی ہے۔

لیکن یہ ذکر اِس وقت کا ہے جب ہم اکیڈمی کی طرف رواں دواں بین الاقوامی معاملات پر تدبّر فرما رہے تھے۔

برطانیہ ...... کیپٹن فلپ ...... شہزادی این ...... کیپٹن اشفاق ......
ہر جسّت پھُولوں کی کیاریاں ...... مخملیں سبزے کا فرش، روِش روِش مہکتے گلزار، دہکتے گلاب، شفاف پانی کے خُوبصورت جھرنے، گھنے پیڑوں کی چھاؤں میں نازنین کلیوں کے بستر اور اس پر براجمان نازک اندام پھُولوں کی ایک شہزادی کسی ہم ایسے افسر کی آمد کی منتظر ...... اِک شانِ دلربائی سے ہم اس کی طرف بڑھے۔

ایک لمحے کو ٹھٹکے، سوچا کوئی تحفہ تو ساتھ لے لیں۔ کیا ہونا چاہیے؟

"پکوڑے! گرما گرم پکوڑے! پان! سگریٹ ...... بیٹ!"

مختلف خوانچہ فروشوں کی چیخ و پکار نے ہمیں حقیقت کی دُنیا میں لا کھڑا کیا۔ بس حویلیاں پہنچ چکی تھی۔

سفر دوبارہ شروع ہُوا۔ ذہن ایبٹ آباد کی وادی سے دو تین میل پرے پی ایم اے

کے گیٹ سے جا اُلجھا۔ خیالات کاکول کی ان حسین وادیوں پر پریشاں تھے۔ جن میں آئندہ ایک سال کا بسیرا تھا۔ پی ایم اے کے بارے میں معلومات ایک فلم کی طرح ذہن کی ریل پر چل رہی تھیں۔

اس سے پہلے صرف ایک بار پی ایم اے آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ یہ موسم گرما کی ایک شام تھی۔ آوارہ بادلوں کے ٹکڑے پرے کے پرے جیسے آسمان کی وسعتوں میں تیرتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی بجلی بھی کوند جاتی۔ پی ایم اے کی کینٹین روڈ سے کاکول کی تمام وادی نظر آتی ہے اور ہر سو تاریکی کے اس سماں میں خود وادی میں سینکڑوں مکانات کی کھڑکیوں سے جھلکتی روشنیاں ایسے جلتے بجھتے چراغوں کی مانند لگیں جنہیں دیوالی کے کسی تہوار پر دیو داسیوں نے قطار اندر قطار طاقوں اور دیواروں پر سجا دیا ہو۔

میدانوں کی جھلستی گرمیوں سے نکل کر کاکول پہنچنا اور وہ بھی اس خواب آور موسم میں کون کافر ہوگا جو کیڈٹ نہ ہوا اور حسین موسم کی آنکھ مچولیاں دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں کا نہ ہو جانا چاہے۔

احمد فراز نے انہی وادیوں کے بارے میں کہا تھا ؎

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہرِ سبزہ و گل
جہاں گھٹائیں سرِ رہگزر جھومتی ہیں
جہاں ستارے اُترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پہاڑ کی قوسیں فلک کو چومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں
چنار و سرو کی پرچھائیوں میں گھومتی ہیں

حادثہ یہی ہوا کہ اس موقع پر ہم کیڈٹ نہ تھے۔ یونیورسٹی کے ایک طالب علم تھے جسے کاکول کی یہی ہوائیں بھا گئیں اور کینٹین روڈ پر محوِ خرام ان کیڈٹوں کا انداز بھی کہ جن کے ہاتھ کے اشاروں کنایوں تک سے ایک نظم و ضبط جھلکتا ہے۔ چال میں عسکری

زندگی کا استقلال اور چہروں پر عزمِ نو کی سرخیاں

سنا تھا موٹے موٹے اولوں کی بارش کا سماں ہو یا روئی ایسے برف کے گالوں کے گرنے کا منظر، موسم گرما کی خواب آور دوپہریں ہوں یا سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی سرد شامیں پی ایم اے کی زندگی میں جمود یا تعطل نہیں آنے پاتا۔ زندگی تمام تر جدوجہد کے ساتھ رواں دواں رہتی ہے۔ کیڈٹ سورج نکلنے سے بہت پہلے بیدار ہو کر رات گئے تک مصروف رہتے ہیں۔ ہم بنیادی طور پر ایجوکیشن کور کے لیے سلیکٹ کیے گئے تھے۔ اس لیے ان مصروفیات کا جو خاکہ ہمارے ذہن میں ابھر رہا تھا وہ یہی تھا کہ لائبریری کے پرسکون گوشے ہمارا مسکن ہوں گے اور موٹی موٹی کتابوں میں غرق رہنا ہمارا مصرف۔ قلم کے تیشے سے تحقیق و تصنیف کے پہاڑ کھودنا ہماری مشقیں اور فوجی بینڈ کی دُھنوں کے پس منظر میں عمر خیام کی رباعیاں لہک لہک کر پڑھنا ہماری ڈرل۔ مثنوی مولانا روم کو سمجھنا ہماری ذمہ داری قرار پائے گی اور ڈاکٹر اقبال کے فلسفوں کی نئی نئی موشگافیاں کرنا ہمارا مشغلہ۔ فارغ اوقات میں غالب کے شعروں کی نئی نئی تعبیریں کریں گے اور مصروفیات کے بڑھ جانے پر ڈیل کارنیگی کے "مشوروں" کی تلاش۔ جب کالی گھٹائیں جھوم کر اٹھا کریں گی تو مولانا محمد حسین آزاد کے کلام پر بحث ہوگی اور سرد راتوں کی ٹھٹھرتی ہوئی تنہائیوں میں میر کی غزلوں پر تبصرے۔ اور جب اداسیاں بڑھ جایا کریں گی تو دل بہلانے کو ہم ایبٹ آباد کی حسین وادیوں میں جنگل کی ان شہزادیوں ...... "مانسہرہ، مانسہرہ، چلو بھی مظفر آباد بھی!"

نئی منزل کے داعیوں نے ہمیں ایک بار پھر جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایبٹ آباد آ چکا تھا۔ یہاں سے پی ایم اے دو تین میل کے فاصلے پر ہے۔

سورج مغرب کی وادیوں میں روپوش ہو چکا تھا۔ لیلائے شب نے زلفیں بکھیر دی تھیں اور جھلمل کرتا ایبٹ آباد کا خوبصورت شہر اپنی تمام تر جگمگاہٹوں کے ساتھ وا تھا۔ سوچا ایک رات یہیں ہوٹل میں گزاری جائے۔ طویل سفر کی تکان دور ہو لے تو چلیں۔ لیکن پھر سوچا کہ کاکول بھی تو کوئی زیادہ دور نہیں۔ ابھی جا کر لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ نہانے وغیرہ کی کمی صبح اٹھ کر پوری کر لیں گے۔

ٹیکسی پکڑی اور جگمگ کرتے شہر کو پیچھے چھوڑ، چناروں کے دو رویہ درختوں کے درمیان سے گزرتے جب پ ک سے کاکول پہنچ گئے۔ گیٹ پر محافظوں نے ٹیکسی کو اندر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ٹیکسی والے کے پیسے چکائے اور اپنے اکلوتے اٹیچی کیس کو اٹھائے خدا کا نام لے کر پاکستان ملٹری اکیڈیمی میں داخل ہو گئے۔

ابھی دو چار قدم چلے ہوں گے کہ دائیں جانب کچھ روشنی اور کچھ فوجی باتیں کرتے نظر آئے۔ سوچا یہی استقبالیہ ہو گا۔ قدم دائیں جانب اٹھ گئے۔ لیکن ....

"ارے بھائی ٹھہرو! یہ کیا ہوا؟ بات تو سنو! ارے میاں"

ہڑبڑاہٹ میں ہم نے ایک سنتری کو روکنے کی ناکام کوشش کی جو رائفل چھتیائے ہماری جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر رک کر اس نے ایک دہشت انگیز سا نعرہ لگایا اور دھاڑا: "تم کون ــــ؟"

ہم نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم اپنی ہی فوج کے آدمی ہیں لیکن اس نے پھر دھاڑنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار میں سے صرف یہ بات ہمارے پلے پڑ سکی کہ وہ ہم سے کوئی "کوڈ ورڈ" (CODE WORD) پوچھ رہا تھا۔

ہم بوکھلائے کھڑے تھے کہ ایک شریف قسم کا فوجی ہمارے قریب آیا۔ ہم نے تعارف کرایا تو اس نے رائفل والے گوریلے سے کچھ کہا جسے سن کر وہ انسانوں کی جون میں واپس آ گیا اور ہمارے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بتایا گیا کہ یہ استقبالیہ نہیں ہے بلکہ اکیڈیمی کی کوارٹر گارڈ ہے اور سنتری ہمیں ڈیوٹی افسر سمجھ بیٹھا تھا۔ اور اس سے پہلے کی تمام کارروائی اس لیے کی جا رہی تھی کہ سنتری یہ سمجھا تھا کہ کوئی ڈیوٹی افسر چیکنگ پر ادھر آن نکلا ہے۔ ہم نے نرمی سے انھیں سمجھایا کہ ہم آئے تو افسری بننے کے لیے ہیں لیکن فی الحال ان کی وہ دہشت انگیز کارروائی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مسکراہٹوں کے تبادلوں کے بعد انھوں نے ہمیں بٹالین میس کا راستہ سمجھایا۔

میس میں ابتدائی کارروائی تھوڑی دیر ہی میں پوری ہو گئی۔ ایک عدد چٹ ہمارے حوالے کی گئی جس پر کمپنی کا نام اور کمرہ نمبر وغیرہ لکھا تھا۔ ایک بیرے نے ہمارا سامان

اٹھایا اور چلے ہم کمپنی کی جانب۔ میس سے کمپنی تک کا راستہ بعافیت طے ہو گیا لیکن ابھی اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں پر قدم رکھا ہی تھا کہ تحکم سے بھرپور ایک پکار سنائی دی۔ برآمدے سنسان تھے۔ خود کو اس کا مخاطب سمجھتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو ایک صاحب نے بڑی نخوت سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ سخت غصہ آیا کہ کون بدتمیز ہے یہ شخص جسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔

پوچھا "فرمائیے؟"

"واٹ ـــ!" وہ دہاڑے۔ اس کے بعد وہ چند لمحے انگریزی کی اس زبان میں ہم سے مخاطب رہے جو اس سے پہلے کہیں پڑھی تھی نہ سنی ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے معلوم ہو رہا تھا کہ "افسر بکارِ خاص" ہیں اور ہم سے کوئی فاش غلطی سرزد ہو گئی ہے۔

"انگریزی معلّی" سے کچھ سادہ سی زبان پر اترے تو معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف ہمارے کھڑے ہونے کے انداز پر معترض ہیں بلکہ لال پیلے ہونے کی ایک وجہ ان کے حضور سلام نہ کرنا بھی ہے۔ تھوڑی دیر میں معلوم ہو گیا کہ اکیڈیمی کا ہر سینیئر "افسر بکارِ خاص" ہے اور جونیئروں کو اکیڈیمی کے ابتدائی آداب سکھانا، غلطیوں پر سرزنش کرنا اور ذہنوں سے شہری زندگی کی آسائشیں بھلا دینا اس کی ڈیوٹی۔ سو ہمارا پہلا سبق تھا ــــــــ کسی سینیئر سے گفتگو کرتے وقت کھڑے ہونے کا انداز اور قبل ازیں انھیں دیکھتے ہی "سلام علیکم سر" کا نعرہ بلند کرنے کی مشق۔

یہ سبق انھوں نے خاصی محنت سے یاد کرایا (محنت ہم سے کرائی گئی) اس سبق کے ضمنی سوالات کے طور پر ہمیں مختلف انداز سے سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی مشقیں بھی کرائی گئیں۔ جن کا تصور پی ایم اے میں آئے بغیر کیا ہی نہیں جا سکتا ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

بالآخر انھوں نے حکم دیا کہ سامان کمرے میں رکھ کر "کاپل" سے مل لینا۔ فی الحال دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور جب تک وہ اپنے کمرے میں نہ پہنچ جائیں ـــ

"سلام علیکم سر!" "سلام علیکم سر!" پکارتے رہو۔

ہم نے گلا پھاڑ پھاڑ کر انھیں سلام نیاز پیش کرنا شروع کیا۔ طویل سفر کی تھکان اُمڈ میں نیند کا خمار، جسم ڈھیل ڈھیل اور پہلا سبق۔ گلے کی رگیں پھول گئیں۔ کان کی لویں جلنے لگیں، خون کا سارا جوش چہرے پر ہست کیا۔ لیکن ان کی طرف سے کوئی سگنل نہ آیا کہ وہ کمرے میں پہنچ چکے ہیں یا نہیں اور جب ہماری آواز ماند پڑنے لگی تو بیرے نے کہ بیچارہ سامان اُٹھائے دست بستہ کھڑا تھا، چپکے سے مشورہ دیا:

"صاب! بس اب چلیں۔"

دیوار کی جانب سے منہ پھیرا۔ ایک نظر بیرے کو دیکھا، ایک نظر خالی برآمدے پر دوڑائی اور سر جھکا کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔

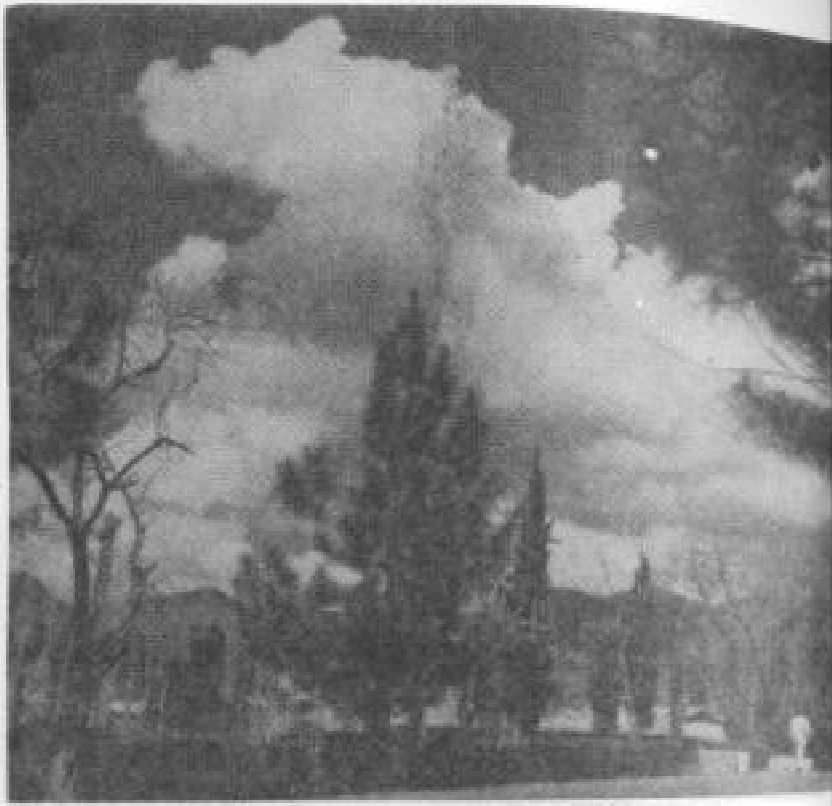
خدا خدا کر کے کمرے تک پہنچنا نصیب ہوا۔ بیرے نے سامان ایک طرف رکھا اور ہماری شان میں ایک قصیدہ کہا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ ہم بہت اچھے "صاب" ہیں اور اسے ایسے "صاب" کا سامان اُٹھانے میں بڑا فخر محسوس ہوا۔

ہم بہت شکر گزار ہوئے کہ چلو کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جسے ہماری قدر معلوم ہے۔

ہم نے دس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا یہ سوچ کر کہ جاتے پیسے پاس کر دیتا یا واپس کر دے گا لیکن مسکراتے ہوئے اس نے نوٹ تھاما، نیازمندی سے سلام پیش کیا اور یوں غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

کمرے میں ایک اور صاحب پہلے سے موجود تھے۔ "کاپل" سے ملنے کا حکم راستے میں مل چکا تھا۔ یہ لفظ انگریزی کا Couple بمعنی 'جوڑا' نظر آیا۔ سوچا شاید یہ یونیورسٹی ہاسٹل کے رومیٹ (Room MATE) کے مترادف لفظ ہے اور اکیڈمی میں ایک ہی کمرے میں ٹھہرنے والے ایک دوسرے کے (Couple) کہلاتے ہوں گے۔ ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔

"آپ ہمارے کاپل ہیں ——— ؟"



ابھی تک ہے نظر میں وہ شہرِ سبزہ و گل

انھوں نے لرزتی آواز میں بتایا کہ نہیں، تمھارے ہمارے سب کے کاپل سر فاروق ہیں۔ انہیں تلاش کر کے ان سے ملو۔

اب تک سر کا تصور ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ انگریز کچھ لوگوں کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں "سر" کا خطاب بخشتا رہا ہے۔ اسی حوالے سے سر سید، سر عبدالقادر اور ڈاکٹر محمد اقبال وغیرہ کی شخصیتیں ذہن میں اُبھریں۔ ڈھیر سارا لیکن یہ سر فاروق نام کی کوئی شخصیت یاد نہ آسکی۔ یہی سوچتے سوچتے کوریڈور میں چلے جا رہے تھے کہ ایک گرج سنائی دی ——— "تھم!"

اور دوسرے لمحے خوبصورت فریم کی عینک کے پیچھے سے دو موٹی موٹی آنکھیں



جہاں گھٹائیں سبز جنگل پر جھومتی ہیں

گھور رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ سر فاروق کے روبرو کھڑے ہیں اور تھوڑی دیر بعد یہ بات بھی ہمارے علم میں لائی گئی کہ اکیڈمی "سروں" سے بھری پڑی ہے۔ ہر سینیئر کے نام کے ساتھ یہ خطاب چپاں ہے۔ اور کاپل، کارپورل کا اُچٹتا سا نام ہے مگر حکم ملا کہ ابھی کوارٹر ماسٹر کے ہاں جا کر کٹ (Kit) ایشو کرا لاؤ۔ یس سر کہہ کر قدم آگے بڑھ گئے۔ اب تلاش تھی کوارٹر ماسٹر کی

"یہ کوارٹر ماسٹر کیا ہوا بھئی ——— ؟"

اوّل تو اکیڈمی میں ماسٹر کا وجود ہونا ہی نہ چاہیے۔ پروفیسر یا کم از کم لیکچرر ہونے چاہئیں۔ اور اگر ماسٹر ہوں بھی تو کوارٹر ماسٹر کیوں، مکمل ماسٹر کیوں نہ ہوں۔

اس سارے تجربے کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ گیٹ سے کمرے تک پہنچنے کے لیے جن غیر معمولی مراحل سے گزرنا پڑا ہے ان کی وجہ سے توازن کچھ بگڑ گیا ہے شاید۔ اس لیے سر فاروق کا حکم اَن سُنا گیا۔ انھوں نے یہ کہا ہوگا کہ ماسٹر کے کوارٹر سے جا کر کٹ وغیرہ لے آؤ۔

"ہاں یہ سمجھ میں آنے والی بات ہوئی۔ ماسٹر کا کوارٹر۔ بھلا کوارٹر ماسٹر کا کیا مطلب ہوا؟ ——— ایک پاؤ ماسٹر؟"

لیکن یہ ماسٹر صاحب کون سے ہیں اور ان کا کوارٹر کہاں واقع ہے۔ یہ بھی معلوم نہ تھا۔ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ ایک سینیئر قریب سے گزرے۔ "سلام علیکم سر" کا نعرہ لگا کر ان سے معذرت کرتے ہوئے پوچھا "سر! یہ ماسٹر صاحب کا کوارٹر کون سا ہے سر!؟"

"وہاٹ ——— ؟" پوری عمارت ایک دھماکے سے لرز اٹھی۔ ہم نے سوال دہرایا۔ انھوں نے سینیئر سے پوچھا کہ کون سے ماسٹر صاحب! ہم نے کہا وہ جن کے پاس کٹیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ تب انھوں نے ہمیں اٹینشن ڈاؤن یعنی ڈسٹری بیوشن میں جانے کا حکم صادر فرمایا اور خود ہنسی کا گولا بن گئے اور ہر آنے جانے والے سینیئر کو دعوت دینے لگے کہ دیکھو یہ کٹ ایشو کرانے کے لیے ماسٹروں کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد وہ اپنے حصے کا سبق پڑھا کر ہماری جان بخشی کر گئے۔ معلوم ہوا کہ فوج کے اس عہدے دار کا انگریزی کی عام لغت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کوارٹر ہونے کے باوجود ایک بھرپور شخصیت کا مالک ہے۔ راشن، وردی وغیرہ کا ٹھیکیدار ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے جغادری اس کے سامنے جلیبیں بھرتے ہیں اور ماسٹر ہونے کے باوجود یہ پڑھانے لکھانے کے جھنجھٹ سے آزاد ہے۔

قصہ مختصر کوارٹر ماسٹر کو تلاش کیا اور عرضِ مدعا کے بعد چاہا کہ کٹ عطا ہو۔ اب جو سٹور کھولا ایک فہرست ہمارے ہاتھ میں تھما، انھوں نے ہمیں چیزیں دینی شروع کیں تو انگریزی دانی کا رہا سہا اعتماد رخصت ہوتا نظر آیا۔ کے آئی ٹی (Kit) کٹ کے معنی

وردی کی گردان ہمیں ابھی تک یاد تھی لیکن یہاں تو کمبلوں، چادروں اور تکیوں کی سمجھ میں آنے والی اشیاء سے لے کر بگ پیک، سمال پیک، مشریپ، فیلڈ ڈریسنگ جیسی ناقابلِ فہم اشیا (یہ نام ہمیں بعد میں معلوم ہوئے) شامل تھیں۔ ہم نے عرض کیا کہ وہ الابلا تم اپنے پاس ہی رکھو۔ فی الحال ہمیں ضروری چیزیں دے دو۔ باقی پھر لیتے رہیں گے۔ اُس نے بتایا کہ جناب! یہی تو ضروری چیزیں ہیں جن کی ضرورت آپ کو روزانہ پڑتی رہے گی۔"

کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ سارا سامان اٹھوائے ہم کمرے میں آ گئے

ذائقوں کا ورثہ

رات بھیگ چلی تھی۔ سفر کی تکان اور استقبال کی ابتدائی رسوم نے جسم کے انگ انگ میں ایک درد سمو دیا تھا۔ قدم لڑکھڑائے جاتے تھے۔ آنکھیں بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ نرم نرم بستر دعوتِ خواب دے رہا تھا۔ پر آنتیں تھیں کہ قل ہو اللہ بلکہ چاروں قل پڑھ رہی تھیں۔ کھانا کمرے میں منگا لینے کی کوئی صورت پی ایم اے میں سوائے اس کے موجود نہیں ہے کہ ڈاکٹر معائنہ کرنے کے بعد آپ کو چلنے پھرنے سے معذور قرار دے کر "اٹینڈ سی" (Attend 'C') کے اعزاز سے نواز دے۔

یہ "اٹینڈ سی" کا اعزاز بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ جب ڈاکٹر کے نزدیک کیڈٹ کا حرکت میں رہنا اس کی صحت کے منافی نظر آئے اور آرام اشد ضروری ہو تو اسے اس اعزاز سے سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کیڈٹ کا اپنے کمرے سے باہر نکلنا، رہائشی عمارت سے باہر آنا چاہے بستر پر پڑے پڑے ٹوٹے جسم کی تفریح کی خاطر چہل قدمی کے لیے ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح ایک سنگین جرم ہے جس طرح پی ٹی یا ڈرل کے پیریڈ میں ایک لمحے کے لیے ساکت ہو جانا۔

اب یہ اعزاز پہلے روز تو ملنے سے رہا اور اس کے بغیر بارش ہو، طوفان آئے، بادل گرجیں، بجلی چمکے، میس سے چھٹکارا ممکن نہیں ___ کہ محفل میں بیٹھنے کا سلیقہ، میز کے آداب، چمچوں اور کانٹوں کا بغیر آواز استعمال اور گرم گرم کھانا، چائے بغیر کسی "اُف" یا "سی" کے حلق میں انڈیل لینے کے نادر طریقے وہیں سکھائے جاتے ہیں۔ اس سب کچھ کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ جی ہاں! جب کیڈٹ

ان آداب میں مشاق ہو جاتے ہیں تو اس وقت ان کے سینئر ہونے کے دن بھی آ چکے ہوتے ہیں اور "ضرورت" نہ ہونے پر چمچوں کو ان کے مقام پر رکھا جاتا ہے۔ تاہم کسی ٹبے افسر کی آمد یا "ڈنر نائٹ" کے دن ان چمچوں اور کانٹوں کی قسمت پھر چمک اٹھتی ہے۔

بات ہو رہی تھی میز کے آداب کی! مصیبت یہ ہے کہ تربیت کے ان مرحلوں سے سینئر کیڈٹوں کی آنکھوں تلے گزرنا پڑتا ہے جو ہر طرح کی تربیت دینے کے لیے ہر وقت مستعد اور غلطیوں پر گرفت کے لیے ہمہ دم تیار بلکہ بے چین بیٹھے رہتے ہیں اور یہاں تو معاملہ تھا ابتدائی اسباق کا اور قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا خدشہ۔ دل پر جبر کر کے آنے والے حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کا عزم لیے کمرے سے برآمد ہوئے۔

تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ ایک گونج سنائی دی۔

"ٹھہرو!"

قدم خود بخود رک گئے۔

"کہاں چلے ہو؟"

"میس سر!"

"بھوک لگی ہے؟"

"یس سر!"

"کیوں؟"

اور سر کی گردان ختم ہو گئی۔ ابھی ہم اپنی بھوک کا جواز تلاش ہی کر رہے تھے کہ وہ پھر گویا ہوئے "میس کیوں جاتے ہو؟"

گویا میس میں کھانا کھانے کے علاوہ کچھ اور کرنا بھی ممکن ہے۔ جی میں آیا کہہ دوں۔ "جھک مارنے؟" لیکن جونیئر کیڈٹ کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ "وہ کچھ نہیں کہہ سکتے" جو ان کے جی میں آئے۔ پانی کی سخت طلب کے باوجود محض غصہ پینے پر اکتفا کیا اور عرض کیا:

"کھانا کھانے سر!"

"کیوں؟"

"کیوں" شاید ان کا تکیۂ کلام تھا۔ خاموشی میں عافیت نظر آئی۔ انھوں نے ازراہِ نوازش جان بخشی کی اور ہمیں ساتھ لیے روانہ ہوئے۔ میس پہنچ کر وہ کسی اور جانب بڑھ گئے اور ہم ہوئے متلاشی کسی خالی نشست کے۔ ایک میز پر خالی کرسی نظر آئی۔ لپک جھپک کر فوراً اس پر براجمان ہو گئے۔ میز کے ارد گرد بیٹھے دوسرے جونیئروں نے دبی دبی ہنسی سے ہمارا استقبال کیا۔

سوالیہ نظروں سے ہم نے باری باری سب کو دیکھا۔ نظریں بائیں جانب ایک "سر" پر رک گئیں جو مسلسل ہمیں گھور رہے تھے۔ اندازہ ہوا کہ کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ انھوں نے پوچھا:

"نئے آئے ہو ــــ؟"

"یس سر!"

انھوں نے کھانا روک کر اپنے حصے کا سبق شروع کیا۔

"میز پر پہلے سے کوئی سینئر موجود ہو تو ان سے بیٹھنے کی اجازت لیتے ہیں جو وہ عام طور پر دے دیا کرتے ہیں۔ کوئی سینئر نہ ہو اور اپنے برابر کا یا جونیئر موجود ہو تو ان سے معذرت کرتے ہیں (یہ معذرت بھی بلا استثنا قبول کر لی جاتی ہے) بیٹھنے کے لیے نشست کی بائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے کانٹوں اور چمچوں کی آواز پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ موسیقی کا شوق ہو تو اسے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ کھانا ختم کر کے میز پر باقی رہ جانے والوں سے معذرت کرتے ہیں پھر نشست کی دائیں جانب کو اٹھتے ہیں، اتنی آہستگی کے ساتھ کہ کرسی کی آواز پیدا نہ ہو۔"

ہم نے بڑی "تابعداری" سے کچھ سمجھتے ہوئے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گردن ہلائی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ان آداب کا خیال رکھا جائے گا۔

"آئندہ ــــ؟ کیا مطلب ــــ؟"

سبق ختم ہو چکا تھا۔ اب پریکٹیکل کی باری تھی۔ سر جلال ہی تھے۔ پی ایم اے میں آج کا کام کل پر کیا تھوڑی دیر کے لیے بھی ملتوی کرنا جرم ہے۔ حکم ملا کہ ہم میز سے اٹھ جائیں، ہال سے باہر جائیں اور دوبارہ آ کر بیٹھیں۔

اُٹھے اور غلطی کر گئے۔ ابھی تو سر نے بتایا تھا کہ دائیں جانب کو اُٹھتے ہوئے نشست چھوڑتے ہیں اور ہم بائیں جانب کو اُٹھے تھے۔ بٹھا لیے گئے۔ پھر اُٹھائے گئے۔ غرض کھانا کھانے سے پہلے خاصے اسباق سے گزرنا پڑا جن میں نظری اسباق کم اور عملی اسباق زیادہ تھے۔

خدا خدا کر کے سر نے ہمیں چین سے بیٹھنے دیا۔ پھر پوچھا:

"کیا کھاؤ گے؟"

"جو آپ کا حکم ہو، سر!" اسباق اپنا رنگ لا رہے تھے۔

سر مسکرائے، میز پر نظر دوڑائی۔ بھنا ہوا مرغ ہماری توجہ کا مرکز تھا۔ اُنھوں نے اشارے سے اجازت دی۔ ہم نے ایک پلیٹ اپنی طرف سرکائی اور مرغ کی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ حکم ملا۔

"پلیٹ نہیں گلاس رکھو اپنے آگے۔"

جانے وہ ہمیں کیا کھلانا چاہتے تھے یا پلانا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے گلاس اپنے آگے سجا لیا اور مزید احکام کے لیے سوالیہ نشان بن گئے۔ سر نے کہا کہ ایک عدد چمچ اُٹھا کر اس کے مزید چمچ کیے جائیں اور انھیں گلاس میں انڈیلا جائے۔ ہم نے تعمیلِ ارشاد کی۔ کہا کہ ایک چمچ چکھو۔ پوچھا "نمک کم ہے؟" خواہ مخواہ ہونٹوں سے پھسل گیا "یس سر!"

"ٹھیک! اُٹھاؤ نمک دان!" اور پھر خود ہی نمک کی وافر مقدار گلاس میں انڈیل دی۔ پھر کالی مرچوں کے سفوف سے لبریز ایک چمچ "پی ایم اے کے نام پر" شامل کر دیا۔ پھر دریافت کیا کہ باقی کیا رہ گیا۔ ہم نے دال والے ڈونگے کی طرف دیکھا۔ حکم ہوا کہ اسے بھی شامل کر لو۔ جانے کیوں ہمیں احمد فراز کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں!

بعد میں ایک مشفق سے ذکر کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ اس وقت یہ شعر بے موقع یاد کیا تھا۔ اس موقع پر پانی کی باری تھی۔ گلاس میں اتنا پانی ڈالا کہ وہ لبریز بلکہ خوں ریز ہو گیا۔ اب حکم ہوا۔

"اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرو!" (Do full justice with it)

ہم شش و پنج میں کہ کیا سلوک کیا جائے اس مقوبے کے ساتھ۔ سر نے ہماری مشکل حل کر دی۔ اُبلتی آنکھوں کے ساتھ کہا: "جلدی کرو۔"

اور ہم نے جلدی سے پہلے اسے نوشِ جان کیا اور جو بچ گیا اسے تناول فرمایا۔

یہ تھا پی ایم اے میں ہمارا پہلا ڈنر، جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ پیٹ کے مجلد کل پرزوں نے فوراً ہڑتال کر دی۔ منہ سے لے کر پیٹ تک کے تمام متاثرہ عناصر ایک احتجاجی جلوس کی شکل میں منہ کے راستے باہر آنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے لیکن ظاہر ہے میس کا چمکتا دمکتا فرش، خوبصورت فرنیچر اور سب سے بڑی بات سر کی موجودگی ـــــ ہماری قوتِ ارادی کو مضبوط ہونا ہی چاہیے تھا اور ہم بڑے صبر و شکیب سے گوش بر آواز تھے۔

سر ہمیں سکھلا رہے تھے ـــــ چھری دائیں ہاتھ میں رکھو، کانٹا بائیں ہاتھ میں، گلاس دائیں جانب اور پلیٹ میں بنے ہوئے پی ایم اے کے مونوگرام کا رُخ سامنے کی جانب۔ دوسری جماعت میں ہمیں پڑھایا گیا تھا کہ نکلتے ہوئے سورج کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہو جاؤ تو سامنے مشرق، پیچھے مغرب، بائیں شمال اور دائیں جنوب ہوتا ہے۔ یہ سمتیں آسانی سے یاد ہو گئی تھیں بلکہ ابھی تک یاد ہیں لیکن بھوکے پیٹ کھانے سے بھری میز پر سمتوں کے تعین کے یہ سبق تھے کہ ذہن میں بیٹھ ہی نہیں رہے تھے۔

اس کے بعد جانے کیا کھایا اور کیا پیا، اتنا یاد ہے کہ اوّل تو میس کے آداب بہت جلد یاد ہو گئے، دوسرے جب ہم سینئر ہوئے اور کچھ اور لوگ تفنن کی تلاش میں

ہماری زیرِ کمان آتے تو ان کے لیے جو خوراک ہم نے تجویز کی وہ ہمارے لیے تجویز کی گئی خوراک کے مقابلے میں خاصی خوش ذائقہ تھی۔

فاقوں کے تسلسل کا یہ ورثہ جانے آج پی ایم اے میں کون کیڈٹ وصول کر رہا ہوگا؟

گردشِ وقت یہاں آن کے تھم جاتی ہے

کہتے ہیں کسی نے نیوٹن سے یا غالباً اسی کے قبیلے کے کسی اور فلاسفر سے پوچھا کہ وقت گزرنے کا احساس مختلف لوگوں کو مختلف انداز میں کیوں ہوتا ہے۔ جواب دینے والے نے ایک مثال دی کہ ایک صاحب کسی دلربا حسینہ کے ساتھ مہکتے پھولوں کی کیاریوں کے قریب بیٹھے اس کے دہکتے رخساروں کو دیکھ رہے تھے اور زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ سورج مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں ڈوب بھی گیا، ستارے جھلملا اٹھے، رات جوبن پہ آئی لیکن ان کا کلام ختم نہ ہوتا تھا۔ تب اس نازنین نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالی اور کہا ۔

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

میر صاحب گھبرائے اور بولے ۔

ابھی ابھی تو آتے ہو
ابھی کہاں چلے ہو تم!

کچھ دنوں بعد وہی صاحب کسی جرم کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔ حاکمِ وقت نے سزا سنائی کہ چند لمحوں کے لیے اس شخص کو تپتے ہوئے توے پر بٹھا دیا جائے۔ سزا پر عمل درآمد ہوا ـــــ بعد میں کسی نے ان سے پوچھا کہ توے پر بیٹھے ہوئے ان کے احساسات کیا تھے۔ (سوال کی نوعیت بتاتی ہے کہ سوال کرنے والا یقیناً کوئی صحافی رہا ہوگا) جواب ملا کہ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔

یہ مثالیں دے کر کہنے والے نے ثابت یہ کرنا چاہا کہ وقت کے احساس کا دارومدار ان خارجی حالات پر ہے جس میں انسان سانس لے رہا ہو۔ وقت کے بارے میں کچھ ایسا ہی سوال پی ایم اے کے کسی کیڈٹ سے کیا جائے تو وہ یقیناً کہے گا کہ گردشِ وقت ڈرل کے پیریڈ میں تھم جاتی ہے۔ ڈرل سکیئر (Drill square) کے چاروں جانب چناروں کے خوبصورت درخت ہیں پھولوں کی کیاریاں ہیں حسین روشیں ہیں لیکن یہ خود توے کی طرح تپتا رہتا ہے اور کیڈٹوں کو بیشتر وقت پھولوں کی کیاریوں سے گزر کر اس ڈرل سکیئر میں جا کر گزارنا پڑتا ہے۔

ڈرل کی ابتدائی تربیت مکمل ہو چکنے کے بعد جو پہلا نظارہ ڈرل سکیئر میں دکھائی دیتا ہے وہ "سلیوٹنگ ٹسٹ" ہے۔ اس ٹسٹ کا کیڈٹ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے اکیڈمی کے ماحول سے دل گھبرا جائے تو کیڈٹ شہر جا سکتا ہے لیکن سلیوٹنگ ٹسٹ میں فیل ہو جانے والوں کو یہ رعایت حاصل نہیں ہوتی۔ ایسے کیڈٹ کسی افسر کو سلیوٹ کرنے کے مجاز بھی نہیں ہوتے۔

ہمارے ٹسٹ کے دن سر پر آئے تو پوری پلاٹون کے لیے نئی وردیاں تیار کروائی گئیں۔ دھوبیوں کو بریفنگ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹسٹ والے دن یوں لگتا تھا۔ جیسے وردیوں کو میدے یا ساگو دانے کی پانی میں نہیں برادے کے محلول میں ڈبو دیا گیا تھا۔ تمام کیڈٹ نہا دھو کر ایک گراؤنڈ میں جمع ہو گئے کہ آج وردیاں انھوں نے خود نہیں پہننی تھیں ان کو پہنائی جانی تھیں۔ تب جیسے سکھیاں کسی دلہن کو سہاگ رات کے لیے تیار کرتی ہیں ہم کیڈٹوں کو ڈرل ٹسٹ کے لیے تیار کیا گیا لیکن مشابہت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دلہن تو بے چاری ؎

"لجائے جاتی ہے، دامن چھڑائے جاتی ہے
نظر ملاتی نہیں، مسکرائے جاتی ہے"

لیکن یہاں کسی کیڈٹ کو انڈر ویئر پہنا کر ایک درخت سے لٹکا دیا گیا تھا اور نہایت احتیاط سے پتلون پہنائی جا رہی تھی۔ کسی کیڈٹ کو کسی دیوار پر بٹھا کر ٹانگوں

سے پتلون میں اتارا جا رہا تھا۔ مقصد اس سارے اہتمام کا یہ ہوتا ہے کہ پتلون میں کوئی شکن نہ آ جائے۔ جب سب لوگ وردیاں پہن چکے تو انھیں بوٹوں میں اتارا گیا اور بیرے نے تسمے باندھے کہ جھکنے سے بھی کریز میں خم پڑنے کا اندیشہ تھا۔ پھر سب لوگوں کو قطار اندر قطار کھڑا کیا گیا اور سینئر کیڈٹ، سٹاف اور بیرے قینچیاں لیے ہمارے چاروں جانب گھومنے لگے کہیں کوئی دھاگہ نظر آتا تو فوراً اس کا سر قلم کیا جاتا۔ یوں ؎

بہزار ناز و بصد ادا
"جو چمن کی سمت کو ہم چلے
تو سکوت غنچوں پہ چھا گیا
وہ گلوں کے چہرے اُتر گئے"

بعد کی تفصیلات غیر ضروری ہیں۔ جو پاس ہو گئے انھیں شہر جانے کی اجازت مل گئی اور وہ ہر ہفتہ اور اتوار کو فیل ہونے والوں کے زخم ہرے کرتے نظر آتے تھے۔

ایک "ٹرم" (Term) گزر جانے کے بعد کیڈٹ کے شانوں پر "ایک بار" کا اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ تبدیلی ڈرل سکیئر میں بار بار اپنا احساس دلاتی ہے کیونکہ ڈرل باقاعدہ وردی پہن کر کی جاتی ہے اور ڈرل کے دوران صفیں درست کرتے ہوئے کیڈٹ کی نگاہیں اپنے دائیں ہمسائے کے شانوں پر ہی مرکوز رہتی ہیں۔

وردی پہنی ہو تو ایک ٹرم کے گزرنے کا احساس ہوتا رہتا ہے اور یہ وردی صرف ڈرل سکیئر میں پہننی نصیب ہوتی ہے ورنہ ابتدائی ایام میں کیڈٹ کا زیادہ وقت یا تو پی ٹی کٹ میں گزرتا ہے یا پھر ایک اور لباس میں جسے پتلون اور قمیص کی طرح علیحدہ علیحدہ پہننے کا تکلف نہیں کرنا پڑتا۔

اس لباس میں یہ عیاشی بھی میسر ہے کہ جوتوں سمیت اس میں "داخل" ہوا جا سکتا ہے اس کے بعد صرف بیلٹ اور کیپ باقی رہ جاتی ہے جسے چلتے چلتے بھی درست کیا جا سکتا ہے۔

عرفِ عام میں اسے ڈانگری کے نام سے پکارا جاتا ہے اور کیڈٹوں میں یہ لباس خاصا مقبول ہے کیونکہ اوّل تو اس کی "کریز" چیک نہیں کی جاتی، دوسرے اس کا استعمال کثیر المقاصد ہے۔ ہتھیاروں کی تربیت کا پیریڈ (Period) ہو یا ان کی صفائی، کاکول رینجز پر فائرنگ ہو یا بیٹل کورس (Battle Course) اکیڈمی سے باہر فوجی مشقیں ہوں یا کیڈٹ کلب میں رات کی حاضری، ہر موقع پر اسے زیبِ تن کیا جاتا ہے بلکہ کسی تھکا دینے والی طویل فوجی مشق یا رات گئے کیڈٹ کلب سے واپسی پر جب اپنے کمروں میں پہنچتے ہیں تو بے سُدھ ہو کر ڈانگری سمیت بستر میں گھس جاتے ہیں۔ یہ لباس ایک بہترین سلیپنگ سوٹ کا کام بھی دیتا ہے۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اسے پہنے ہوئے وہ ڈٹ کر لانگ مارچ کریں، لیٹ جائیں، بیٹھ جائیں یا حسبِ حکم قلابازیاں کھاتے رہیں اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دُھلائی کے وقت دھوبی بھی اسے اپنے مجوزہ ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق وہ محض "ڈرائی کلیننگ" کا مرتکب ہوتا ہے یعنی جھٹک جھٹک کر اس کا گرد و غبار جھاڑ دیتا ہے اور استری کر کے واپس بھجوا دیتا ہے۔ کبھی کبھار احتیاطاً اس کے دو تین بٹن زخمی کر دیتا ہے تاکہ سند رہے کہ ڈانگری باقاعدہ دُھلائی کے بعد واپس جا رہی ہے۔

ذکر تھا پریڈ گراؤنڈ اور گزرتے لمحوں کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے مناظر کا ——— ابتدائی دنوں میں پورا کورس آٹھ آٹھ دس دس کیڈٹوں کے گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ہر گروپ پورے ایک خدو سٹاف کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو "دائیں پھر" (Right turn) اور "بائیں پھر" (Left turn) کی گردان کچھ ایسے تسلسل سے کرتے ہیں کہ کیڈٹ دائیں بائیں کا فرق بھول کر محض "پھر" پر اتر آتے ہیں۔ چنانچہ ایسے نظارے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں کہ سٹاف نے کاشن دیا — "دائیں پھر" اور ایک آدھ کیڈٹ بائیں کو گھوم گیا۔ ایسے مواقع پر سٹاف پر جو کچھ گزرتی ہے۔ اس کا اظہار وہ تو برملا کر دیتا ہے لیکن ہم صرف اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہا

ہی کر سکتے ہیں کیونکہ ان کیفیات کو الفاظ کے سانچوں میں بیٹھا ہی نہیں جا سکتا۔

کبھی کبھار ایڈجوٹنٹ یا شعبہ دار میجر صاحب کی طرف سے حکم ہوتا ہے کہ کیڈٹوں کی بیلٹیں چیک کی جائیں۔

سٹاف چیکنگ پر اتر آتا ہے۔ ایک کیڈٹ کی بیلٹ تھوڑی سی ڈھیلی پائی گئی ہے سٹاف مجسمۂ حیرت بن جائے گا۔

"صاب! یہ بیلٹ باندھی ہے؟ اس میں سے تو پورا بریگیڈ گزر جائے گا۔"

ہم شروع شروع میں بریگیڈ کو کوئی نہایت حقیر سی چیز جانتے رہے کہ جس بیلٹ میں سے سانس کا گزر مشکل ہو وہاں سے اسے بآسانی گزارا جا سکتا ہے۔

یہ ابتدائی دنوں کے کچھ بعد کا ذکر ہے۔ ایک دن سٹاف "اُلٹا پھر" یعنی "اباؤٹ ٹرن" کا سبق پڑھا رہا تھا۔ کیڈٹوں کا مُڑنا تو ٹھیک تھا لیکن سٹاف کا اصرار تھا کہ مُڑنے کے بعد پہلا پیر ذرا بلندی سے آ کر زمین پر "بجنا" چاہیے اور یہ بلندی بیلٹ کی سطح کے برابر ہونی چاہیے۔ پہلے تو سٹاف سمجھاتا رہا پھر غصے میں آ کر خود "ڈیمانسٹریشن" دینا شروع کر دیا۔ "اباؤٹ ٹرن" کا یہ مظاہرہ تھا تو بڑا شاندار لیکن اس حرکت کے دوران "چرر" قسم کی ایک آواز آئی۔ ذہن چونکہ پیروں میں اُلجھا ہوا تھا اس لیے کچھ ٹھیک سے سمجھ میں نہ آ سکا کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ البتہ اس کے فوراً بعد سٹاف نے "اُلٹا پھر" کا کاشن دیا۔ اب پوری کمپنی کا رُخ سٹاف کی مخالف جانب تھا۔ دوسرا کاشن نہ اب ملتا ہے نہ پھر۔ آخر کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ بازوؤں کی جانب کھڑے کیڈٹوں نے پہلے ترچھی نظروں سے پیچھے کی جانب دیکھا۔ پھر تھوڑی سی گردن موڑی اور پھر باقاعدہ پیچھے کا جائزہ لے کر یہ رپورٹ دی کہ سٹاف غائب ہو گیا۔ تب سٹاف کے بالمقابل کھڑے کیڈٹوں نے انکشاف کیا کہ "اباؤٹ ٹرن" کے مظاہرے کے دوران سٹاف کی پتلون بڑی نازک جگہ سے جواب دے گئی ہے۔ اس پر دبی دبی مسکراہٹیں جاری تھیں کہ ایک کیڈٹ نے سٹاف کی نشاندہی کی جو ایک اور سٹاف کو صورتِ حال سے مطلع کرنے کے بعد تیزی سے گراؤنڈ سے باہر جا رہا تھا۔

جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں کیڈٹوں سے توقعات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے پھر ان سے ایک لمحے کی چوک بھی ہو جائے تو ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاف نے حکم دیا "ہوشیار!" پوری کمپنی ہوشیار (Attention) ہو گئی لیکن کسی ایک کیڈٹ کا پیر لمحے کے ایک حقیر سے حصے کی تاخیر سے زمین پر پہنچا۔ یہ معمولی سا فرق بھی شاف کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں رہا۔ وہ کھولتا ہوا کیڈٹ کے پاس پہنچے گا۔

"صاب! کیا تعلیم ہے آپ کی؟"

جواب سن کر اس کا پارہ بلندی کی جس سطح تک پہنچتا ہے عام تھرما میٹروں کے لیے اسے شاید ماپنا بھی ممکن نہ ہو اور پھر اس تعلیم پر تبصرہ کچھ اس انداز سے ہوتا ہے:

"تعلیم تو پوچھو تو اتنی کہ گدھے کتابیں نہیں اٹھا سکتے اور یہاں کاشن ملنے کے بعد کھڑے رہتے ہیں بت کی طرح۔ تین گھنٹے کے بعد پیر اترتا ہے زمین پر۔ کرین منگوا دوں صاب کے لیے؟"

پاسنگ آؤٹ پریڈ قریب آتی ہے تو شافوں کو گراؤنڈ سے باہر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور کمپنیوں کی تمام تر کمانڈ کیڈٹوں کے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ وہ خود ہی ماتحت ہوتے ہیں اور خود ہی افسر۔ گراؤنڈ سے باہر کھڑے شاف کی نظریں اپنی اپنی پلاٹون پر رہتی بلکہ چپکی رہتی ہیں۔ پلاٹون میں کوئی کیڈٹ کسی غیر ضروری حرکت کا مرتکب ہو یا اس سے کسی تاخیر کا جرم سرزد ہو جائے تو شاف کے قدم خود بخود پلاٹون کی جانب اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن حکم چونکہ یہی ہوتا ہے کہ شاف ڈرل سکیئر سے باہر رہیں اس لیے شاف خود کو "تھم" کا کاشن دے کر روک لیتا ہے اور محض دانت پیسنے پر اکتفا کرتا ہے۔ تاہم کبھی کبھار یہ پابندی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ کیڈٹ باوجود کوشش کے ایڈجوٹنٹ کی کوئی بات سمجھ نہیں پاتے اور وہ تنگ آکر شافوں کو پلاٹونوں پر چھوڑ دیتا ہے اور ڈرل سکیئر کے چاروں جانب پھیلے ہوئے شافوں کا یہ منظر بڑے بڑے جغادریوں کا پتہ پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔

اللہ بخشے میجر سروش حسنی کو۔ سفید براق ایسے گھوڑے پر بیٹھے یوں لگتے جیسے پرستان کا کوئی شہزادہ زمین پر اتر آیا ہو لیکن ان میں خرابی یہی تھی کہ وہ شہزادوں کی طرح بولتے

نہیں تھے، جنوں اور مجنونوں کی طرح گرجتے برستے رہتے تھے۔ جوں جوں پاسنگ آؤٹ پریڈ نزدیک آتی جاتی تھی ان کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے کبھی ایک کمپنی کی طرف آتے کبھی دوسری کی طرف ——— پھر حیران و پریشان تیسری کمپنی کو دیکھتے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تو تمام کمپنیوں کو اکٹھا کر کے تقریر کرنا شروع کر دیتے۔

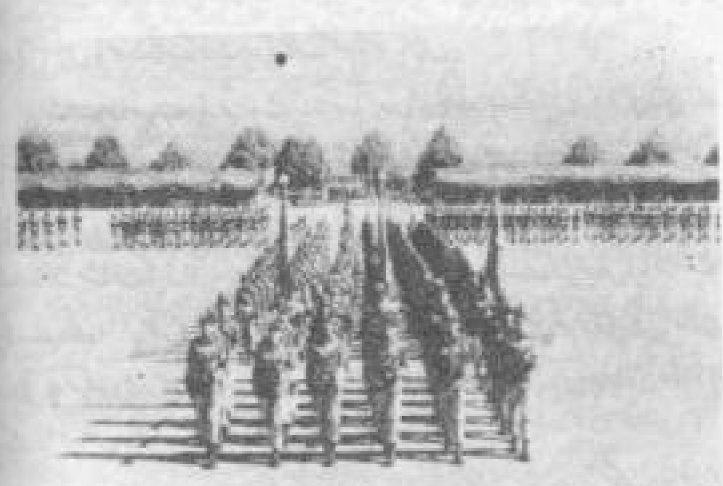
"یہ پریڈ کر رہے ہو تم؟ پاسنگ آؤٹ پریڈ سر پر آن پہنچی اور تمہارا معیار اتنا ہولناک؟ اتنا خوفناک؟ اتنا وحشت ناک؟"

کیڈٹ بے چاروں نے اپنا منوں پسینہ بہایا لیکن ان کی ہولناکیاں، خوفناکیاں اور وحشتیں پاسنگ آؤٹ پریڈ تک ختم نہ ہو پائیں۔

شاف ظاہر ہے ایڈجوٹنٹ کے مصاحبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ ایک دفعہ پلاٹون کو ڈرل کرا رہے تھے۔ چلتے چلتے "تھم" (Halt) کا کاشن دیا۔ پوری پلاٹون ایک پاٹ دار آواز کے ساتھ ساکت ہو گئی۔ بے ساختہ شاف کی زبان سے پھسل گیا، "گڈ!" لیکن پھر جانے کیا خیال آیا کہ بے تحاشا چلانے لگے، "یہ تھم کیا ہے؟ میری محنت کا یہ صلہ ہے؟ میں تم لوگوں کا کیا علاج کروں؟ تم کیوں میری عزت کے درپے ہو گئے ہو؟" کاش میں دفن ہو جاؤں۔ ڈاؤن نیچے زمین میں۔

سارے سال کے دوران پریڈ کے جاں گداز مرحلے وہ ہوتے ہیں جب کسی فوجی مشق سے واپسی ہوتی ہے۔ کیڈٹ اکیڈمی پہنچتے ہیں تو تین چار دنوں کی بے خوابیاں گلابی ڈورے بن کر آنکھوں میں سمائی ہوتی ہیں، بال مختصر ہونے کی وجہ سے الجھے ہوتے ہیں نہ ان پر بکھرے ہونے کی تہمت چسپاں کی جا سکتی ہے۔ تاہم مشق کے دوران سر نہ نہانے کا ہونا اور زمین کا بستر ہونے کی وجہ سے ان میں گرد و غبار کی خاصی مقدار در آتی ہے۔ پسینے اور گرد و غبار سے مل کر وجود میں آنے والی جو تہیں جسم پر جمتی چلی جاتی ہیں وہ ایک سوندھی سوندھی سی خوشبو چھوڑ رہی ہوتی ہیں۔ اکیڈمی جوں جوں قریب آتی جاتی ہے

باتھ روم میں گھس کر جی بھر کر نہانے اور اس کے بعد گھوڑے اور گدھے جو بھی مل جائیں بیچ کر سونے کی خواہش شدت اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن گیٹ پر اترتے ہی صرف شافٹ ملتے ہیں جو اس تھکان سے چور کیڈٹوں کو باقاعدہ فال ان کر کے ڈرل سکیئر میں لے جاتے ہیں اور ان سے پریڈ کرائی جاتی ہے۔ کسی بھی بڑی فوجی مشق سے واپسی پر یہ رسم ضرور ادا کی جاتی ہے۔ معلوم نہیں یہ رسم کس زرخیز دماغ کی ایجاد تھی! اس کا موجد خدا جانے کہاں ہوگا لیکن اس کی ایجاد گھر بیٹھے اس کے لیے ہر سال بے شمار دعاؤں کا سبب بنتی رہتی ہے۔



کیڈٹ کی تربیت کا آخری مرحلہ۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ

لہو گرم رکھنے کے سو سو بہانے

پی ایم اے میں پائے جانے والے کسی کیڈٹ سے اگر پی ٹی گراؤنڈ کا جغرافیائی محلِ وقوع، رقبہ اور حدودِ اربعہ دریافت کیا جائے تو اس کا جواب کچھ یوں ہوگا کہ یہ گراؤنڈ مشرقِ بعید سے مغرب کے آخری کونوں تک اور انتہائے شمال سے منطقہ بارِدہ جنوبی تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کے باوجود ساری کی ساری منطقہ حارہ میں بلکہ عین خطِ استوا پر واقع ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہاں کے مقامی باشندے ہیں کہ ان کا پارہ دسمبر اور جنوری کی سسکتی صبحوں اور ٹھٹھرتی شاموں میں بھی ایک سو دس ڈگری سے اوپر ہی رہتا ہے۔ کیڈٹوں کو حکم ہے کہ ان میں سے این سی اوز کو "شافٹ" اور جے سی اوز کو "صاحب" کے نام سے مخاطب کیا جائے۔ کیڈٹوں کو یہ لوگ صاحب کے نام سے پکارتے ہیں ——— اور گراؤنڈ کی چاروں طرف دوڑاتے رہتے ہیں۔ زمین گول ہونے کے بہت سے ثبوت تو ہم نے سکول کے زمانے میں یاد کیے تھے مگر مزید ایک ثبوت یہاں بھی ملتا ہے کہ پی ٹی پیریڈ میں مسلسل دوڑتے رہنے کے بعد بھی جب وسل بجتی ہے تو کیڈٹ خود کو اسی گیٹ کی راہ پی ایم اے میں داخل ہوتا ہوا پاتے ہیں جہاں سے برآمد ہوئے تھے۔

موسم سارا سال کیڈٹوں سے اٹھکیلیاں کرتا رہتا ہے۔ عین پی ٹی پیریڈ کے موقع پر اچھی بھلی برستی بارش تھم جاتی ہے اور کیڈٹوں کو خم ٹھونک کر اور کمر کس کر (جو ڈرل کے پیریڈ (Period) میں تنگ بیلٹ کی وجہ سے پہلے ہی خاصی کسی ہوتی ہے) میدان میں نکلنا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے عام طور پر ڈرل کا پیریڈ ہوتا ہے یا کوئی اور ایسا پیریڈ جس میں لباس پی ٹی ڈریس سے مختلف ہوتا ہے۔ گرمیوں میں تو لباس کی تبدیلی کوئی ایسا

مرحلہ نہیں، لیکن سردیوں میں جب جسم لرز رہا ہو اور رُواں رُواں کانپ رہا ہو تو ٹھٹھری ہوئی اُنگلیوں کی بے جان پوروں میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ تسمے کے بٹن ہی کھول سکیں۔ لیکن یہاں تو واسطہ فوجی جوتوں کے تسموں سے ہوتا ہے جن کا کھولنا قبائے جاناں کے چاک کرنے کے بالکل برعکس معاملہ ہے۔

کیڈٹ جوتوں سے جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں تو سٹاف ان کے سروں پر مسلط ہوتے ہیں جن کی کلائیوں پر بندھی گھڑیوں کے مطابق کیڈٹ محض تسمے باندھنے میں تین تین گھنٹے ضائع کر دیتے ہیں۔ بالآخر کیڈٹ میدان میں آ نکلتے ہیں اور پورے چالیس منٹ تک جہاں جہاں بارش کے قطرے گرے ہوں اپنا پسینہ بہاتے ہیں۔
موسم گرما میں کیڈٹ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں اور گاتے رہتے ہیں۔

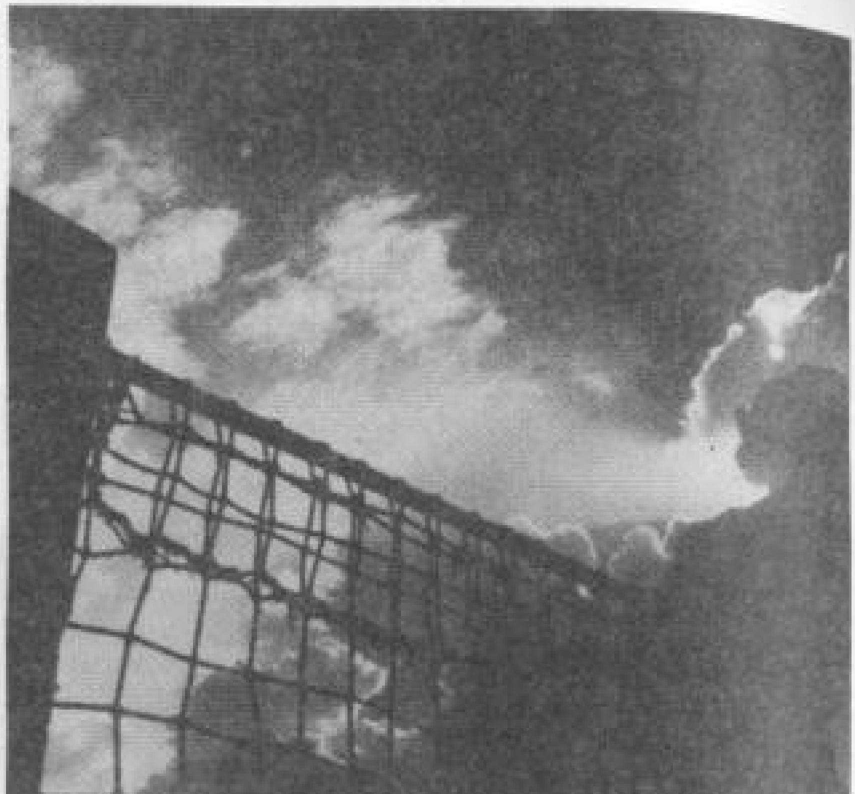
آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

بادل ان کا کہا نہیں مانتے اور آہوں کو کہیں بھی جانے نہیں دیتے۔ چنانچہ بہت سی ٹھنڈی آہیں جمع ہو کر مزید خنک ہو جاتی ہیں اور موسم سرما کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔ تب یہاں کے طور طریقے بدل جاتے ہیں۔ مقامی باشندوں کے مزاج میں خاص تبدیلیاں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہیں۔ وہ کیڈٹوں سے کسی ایک دیوار، درخت یا پول (Pole) کے بارے میں جسے انھوں نے بارہا دیکھا ہوتا ہے بلکہ جسے دیکھ دیکھ کر وہ تنگ آ چکے ہوتے ہیں اکثر پوچھتے ہیں۔ "وہ دیوار دکھتی ہے؟ وہ درخت نظر آ رہا ہے؟" کیڈٹ فوراً اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ لیکن شاید انھیں کیڈٹوں کی بینائی پر شک رہتا ہے، چنانچہ ہمیشہ کہتے ہیں:

"دائیں سے جائیں گے، بائیں سے آئیں گے۔ پہلے دو صاب مانگتا ہوں۔"

جب کیڈٹوں کی پلاٹون ہانپتی کانپتی واپس پہنچتی ہے تو پہلے دو "صابوں" کو کھڑا کر لیا جاتا ہے۔ باقی پلاٹون کو کسی اور چیز کی دائیں جانب بھیج دیا جاتا ہے اور بائیں طرف سے واپس آنے کی ہدایت ملتی ہے۔ باقی دو "صاب" جو اوّل آنے پر

• صاحب



بادل اور کرنوں کی آنکھ مچولی ——— پی ٹی گراؤنڈ کا ایک گوشہ

کسی خوش فہمی کا شکار ہونے ہی کو ہوتے ہیں سٹاف کے مخاطب بنتے ہیں:

"آپ کیا کر رہے ہیں یہاں کھڑے ہوتے؟"

جواب ظاہر ہے خاموشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

"کیوں! اسیر کو آئے ہوتے ہیں؟ واٹ صاحب! سکپ جمپ بگن۔" (Skip jump Begin)

اور کیڈٹ کھڑے کھڑے اچھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سکپ جمپ کا آرڈر عام طور پر پوری پلاٹون پر لاگو ہوتا ہے اور یہ وہ موقع ہوتا ہے۔ جب ایک دو کیڈٹ تو کسی مشق میں مصروف ہوں اور باقی پلاٹون کا بعافیت کھڑا رہنا کیڈٹوں کی صحت کے منافی نظر آئے۔ چنانچہ اور کچھ نہیں تو انھیں کھڑے کھڑے اچھلتے رہنے کا حکم ملتا ہے۔

وہ کیڈٹ جو پچھلی قطاروں میں کھڑے ہوتے ہیں نظر بچا کر محض کندھے اُچکاتے رہتے ہیں اور چند لمحوں کے لیے سکپ جمپ سے نجات حاصل کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ گویا بہشت کے مزے انھیں یہیں مل گئے ہوں لیکن جلد ہی کسی سٹاف کی نظر پڑ جاتی ہے اور وہ فوراً وارننگ دے ڈالتا ہے۔

"چھوڑیں، چھوڑیں زمین کو، پاؤں میں دیمک لگ جائے گی!"

اور کیڈٹ کے قدموں میں خود بخود سپرنگ لگ جاتے ہیں۔



پی ایم اے شیلی؟ دیکھیے تو کتنا وزن ہے اس میں

ایک غیر ملکی مہمان کی پی ایم اے میں آمد

اس گراؤنڈ میں ایک اور اہم چیز "گھوڑا" ہے۔ اسے ہونا تو کسی عجائب گھر میں چاہیے تھا۔ آخر رنجیت سنگھ کا گھوڑا بھی تو لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے لیکن جانے کس نے اسے اس گراؤنڈ میں رکھ چھوڑا ہے۔ ویسے عام تصور یہی ہے کہ گھوڑا سواری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کمبخت گھوڑے پر بیٹھنا جرم ہے۔ حکم یہ ہے کہ دوڑتے ہوئے آؤ اس کی دُم کی طرف سے چھلانگ لگاؤ اور گردن کی جانب سے پار اتر جاؤ۔ اس سارے عمل کے دوران زیادہ سے زیادہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ لگائے جا سکتے ہیں۔ یہ گھوڑا رہتا تو ساکت ہی ہے لیکن ہم نے اکثر کیڈٹوں کو اس گھوڑے پر مشقوں کے دوران اس طرح لہولہان دیکھا گویا اس نے دولتیاں جھاڑ دی ہوں۔ کچھ کیڈٹ تو چھلانگ کے ابتدائی مرحلے میں مطلوبہ بلندی تک نہیں پہنچ پاتے اور گھوڑے کی دُم سے جا ٹکراتے ہیں۔ جو خود کو بلند کر لیتے ہیں وہ گردن پار نہیں کر پاتے اور کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے ہیں، کبھی اس کی گردن پر براجمان ہو جاتے ہیں لیکن ان کا اس طرح بیٹھ جانا نہ صرف اس "لکڑی النسل" گھوڑے کی توہین ہے بلکہ پی ٹی سٹاف اور پلاٹون کمانڈروں کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف بھی ہے۔

پی ٹی کروانے کی ذمہ داری پی ٹی سٹاف پر ہے۔ لیکن پلاٹون کمانڈر جانے کیوں صبح صبح وہاں آن براجتے ہیں۔ کیڈٹوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ پلاٹون کمانڈروں کی ازدواجی زندگیاں انتہائی تلخ ہوتی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کاکول کی حسین وادیاں ہوں، رنگین موسم ہو، دہکتی صبح ہو، نکھرا اُجالا ہو، بادلوں کا سایہ ہو، نشہ سا چھایا ہو اور انسان بے خود نہ ہو جائے۔ یہ لمحے جیون کے ہمراہیوں کے ساتھ گزارے جانے چاہئیں۔ پی ٹی گراؤنڈ میں انھیں ہیڈ ٹون پر ضائع کرنا نرم سے نرم الفاظ میں حماقت ہے اور ـــ

موسم کا احترام نہ کرنا بھی جرم ہے:

گراؤنڈ کی ایک جانب چند کھمبوں سے رسّے لٹکے رہتے ہیں۔ ڈارون کی تھیوری پر اگرچہ ہم کبھی ایمان نہیں لائے، خود کو ہمیشہ اشرف المخلوقات میں سے جانا لیکن مجبور

کیا گیا کہ ان رسّوں پر چڑھنے اُترنے کی مشق بہم پہنچائیں۔ کچھ عرصہ ان رسّوں پر رہنے اور ہاتھوں کے بل کھڑے ہونے (Hand stand) کے بعد جو مہارت ہمیں حاصل ہوتی اس پر ہمیں ڈارون کی تھیوری میں کچھ نہ کچھ صداقت کی ملاوٹ کا شبہ ہو چلا ہے۔ آخر موروثی اثرات کے بغیر ان خارقِ عادت حرکات میں مہارت حاصل کرنا کیونکر ممکن ہے!

ایک اور نادرِ روزگار چیز پی ایم اے شیل (Shell) ہے۔ (اس کا جو نام کیڈٹوں کے ہاں رائج ہے اسے تو یہاں شائع نہیں کیا جا سکتا تاہم یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ صدی کی آخری دہائی تک اس نام میں تبدیلی ممکن نہیں۔ آج اب تک بھی تو یہ نام سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آیا ہے) سیمنٹ کے بنے ہوئے یہ شیل گراؤنڈ کے ایک کنارے پر پڑے رہتے ہیں۔ جونیئر کیڈٹوں کو تو ان سے واسطہ صرف سزا ملنے کی صورت ہی میں پڑتا ہے لیکن سینیئر ہونے پر یہ شیل باقاعدہ پی ٹی کا حصہ بن جاتے ہیں کہ انھیں گردن، رانوں، بازوؤں اور سینے پر رکھ کر کیڈٹوں کے ان اعضاء کو مضبوط بنایا جاتا ہے۔ جو تربیت کے آخری مراحل میں پہنچنے کے باوجود قدرے ڈھیلے رہ گئے ہوں۔

ایک دفعہ ایک غیر ملکی فوجی مہمان پی ایم اے کے دورے پر آئے۔ جانے یہ اتفاق تھا یا پی ایم اے والوں کی شرارت کہ پیریڈ پی ٹی کا تھا۔ معزز مہمان گراؤنڈ میں آئے تو کیڈٹ ان شیلوں کو پیار سے بازوؤں میں اٹھائے پی ٹی میں مصروف تھے۔ مہمانِ خصوصی نے حجم سے اس شیل کے وزن کا اندازہ لگایا اور ایک کیڈٹ سے لینے کے لیے آگے بڑھے۔ کیڈٹ نے شیل ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ ابھی اسے سنبھال نہ پائے تھے کہ کیڈٹ کو لوٹا دیا۔ ساتھ ہی کہا، "ہوں! بھاری ہے!"

کیڈٹ جو چند لمحوں کے لیے اس شیل سے نجات پانے پر باچھیں کھلانے کی کوشش کر رہا تھا، اتنی جلد اس سوغات کی واپسی پر جل ہی تو گیا۔ بولا:

"سر! صرف بھاری ہے؟"



"انھی" راہوں سے گزر کر آگے آسکو تو آؤ"

مہمان مسکرائے۔ پوچھا، "کیا مطلب؟"

"ہمارا خیال ہے، خاصا بھاری ہے۔"

پی ایم اے میں سب سے ہولناک عمل وَن مائل (One Mile) ہے۔ اس کا ترجمہ ایک میل کیا جا سکتا ہے لیکن وَن مائل کا لفظ سن کر کیڈٹ جن کیفیات سے

گزرتا ہے وہ کسی اور لفظ سے پیدا ہو ہی نہیں سکتیں۔ کیڈٹ کو ویسے تو دن میں میلوں بھاگنا دوڑنا پڑتا ہے۔ اور بہت سی دوڑیں ہیں جن میں پانچ میل اور بارہ میل کی دوڑیں بھی شامل ہیں لیکن یہ ایک میل ان سب پر بھاری ہے۔ ان لمبی دوڑوں کے راستے مختلف مرغزاروں اور سبزہ زاروں سے گزرتے ہیں۔ جن کے دامن میں کچے پکے مکانات بھی ہوتے ہیں ــــ ان میں کبھی کبھار کسی حسین چہرے کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ کہیں کہیں ننھے بچے ہاتھوں میں پانی یا لسی کے جگ لیے بھی مل جاتے ہیں۔ آپ پانی پی کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار ستانے کے لیے ٹھہر بھی جاتے ہیں اور پھر بھی وقت پر آ پہنچتے ہیں لیکن اس کم بخت ون مائل میں وقت صرف پانچ منٹ اور چالیس سیکنڈ ہوتا ہے اور روٹ اس کا پی ٹی گراؤنڈ کے گرد دو چکر ہیں۔ کیڈٹ کو اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لاتے ہوئے ایک ہی رفتار سے بھاگنا پڑتا ہے۔ پہلے چند لمحوں میں ہی کلیجہ اچھل کر حلق میں آ جاتا ہے، آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچنے لگتے ہیں، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتا ہے اور اٹھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ چاروں شانے چت ہو کر گرنے کو جی چاہتا ہے لیکن صرف قوتِ ارادی ہوتی ہے جو کیڈٹ کو بڑھاتے لیے جاتی ہے اور یہ قوتِ ارادی بھی گراؤنڈ ہی میں آکر ملتی ہے، وگرنہ پی ایم اے روڈ سے ہی گراؤنڈ میں لگے سرخ جھنڈے نظر آجائیں (جو اس بات کا اعلان ہوتے ہیں کہ آج ون مائل ہوگا) تو کیڈٹوں کے چہروں پر یاس کی زردی چھا جاتی ہے۔ تمام بشاشت رخصت ہو جاتی ہے۔ زردی مائل چہروں کے ساتھ کیڈٹ سٹارٹ لائن پر جمع ہوتے ہیں۔ سیٹی بجتے ہی مائل بہ پرواز ہو جاتے ہیں اور دوڑ ختم ہونے تک تمام چہرے سرخی مائل ہو چکے ہوتے ہیں۔

یہ تمام مشقیں جان لیوا سہی لیکن انہیں کر گزرنے کے بعد کیڈٹ کو جو یقینِ محکم حاصل ہوتا ہے اس سے اس کے دل و دماغ میں یہ بھرپور اعتماد پیدا ہو جاتا ہے جس کے بل پر وہ کہہ سکتا ہے کہ ناممکن کے لفظ کو لغات سے خارج کر دیا جائے۔

پی ٹی مشقوں کے دوران اگرچہ کیڈٹوں کی جان پر بنی رہتی ہے لیکن اس کے ساتھ

ان کی جان بھی بنی رہتی ہے۔ سٹاف جو احکام کی پابندی میں سختی سے کام لیتے ہیں، وقتاً فوقتاً ایسے چٹکلے چھوڑتے رہتے ہیں کہ ساری تھکن کافور ہو جاتی ہے۔ پی ٹی کے انسٹرکٹروں میں ایک جے سی او اردو بڑے منطقی بولنے والوں میں سے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ اس وقت جبکہ کیڈٹ تھکن سے نڈھال ہوں، کوئی ایسا ہنستا مسکراتا فقرہ چھوڑتے کہ کیڈٹ نئے سرے سے تازہ ہو جاتے۔

ایک بار صبح صبح پی ٹی کے پیریڈ میں ون مائل کا مژدہ جانفزا سنایا گیا۔ کیڈٹ سہم سے گئے۔ گراؤنڈ کی چاروں جانب لگے سرخ جھنڈوں سے نظریں بچا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے اور آہستہ آہستہ پھلکا کودنا شروع کیا کہ ون مائل کے لیے تیار ہو



مصنف باکسنگ رنگ میں

سکیں۔ صاحب نے دیکھا تو چلے آئے۔

"کیوں؟ اجرامِ فلکی کا مطالعہ ہو رہا ہے؟ گھاس کے پتّوں سے شبنم کے قطرے ڈھلک نہیں پائے ہیں اور پڑا ہے کسالت کا دَورہ۔"

اِس سے پہلے اور بعد اِتنی آسانی سے دِن ڈھلے کے مرحلے کبھی نہ گزرے تھے — ایک بار سورج غروب ہونے کے بعد کیڈٹوں کو کہیں جانا تھا — قطار در قطار کیڈٹ کھڑے تو تھے لیکن سارے دن کی محنت مشقت اور مُرغن غذا کی وجہ سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ دیکھا، بولے "شفق کی لالیاں مٹنے نہیں پاتی ہیں اور آ رہی ہیں نیندیں! کھڑے ہیں وطن کے محافظ!!"

اور نیند پھلجھڑیاں بن کر پلکوں سے بکھر گئی۔

آنچل کے سایوں سے پیڑوں کی چھاؤں تک

صاحبو! پی ایم اے کے تربیتی مصائب اپنی جگہ لیکن جہاں تک کیڈٹ کا تعلق ہے اسے نرم و نازک پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ رہائش و طعام کی جو سہولتیں کیڈٹ کو حاصل ہیں، وہ افسری کر کے بھی نہیں مل پاتیں۔ ایک خوبصورت، صاف شفاف سا کمرہ، کتابیں رکھنے کو ایک نفیس سا شیلف، رائٹنگ ٹیبل اور جسم تھک جائے تو اٹیچڈ باتھ روم کہ جس میں لگا گیزر ہر وقت نیم گرم پانی لیے کیڈٹ کا منتظر رہتا ہے اور پھر آرام دہ بستر، اس کے پہلو میں لگا ہوا ایلومینیم کی ٹربی سی چادر کا ہیٹر کہ کپڑے جلائے نہ بدن سلگائے۔ بس ہلکی ہلکی سی آنچ چھوڑتا رہتا ہے اور جب کمرے کا درجۂ حرارت آرام دہ حد سے ذرا بھی بڑھنے لگتا ہے تو خود ہی خاموش ہو جاتا ہے اور جب کمرے سے باہر برستے روئی کے گالوں کی ٹھنڈک تھرما میٹر کے پارے کو گرانے لگتی ہے تو اس کا انڈیکیٹر (Indicator) ایک ہلکی سی ٹِک کے ساتھ پھر روشن ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈ کول اور انسانی دماغ کی اِس ایجاد کی یہ آنکھ مچولی رات بھر جاری رہتی ہے اور کیڈٹ پڑا نیند کے مزے لوٹتا رہتا ہے۔ صبح سویرے بیڈ ٹی (Bed tea) ناشتے اور کھانے کے لیے وسیع اور کشادہ ڈائننگ ہال کہ جس کے چکنے فرش پر چلنے کے لیے خاصی مشق کی ضرورت پڑے، ترتیب سے لگی میزیں، قرینے سے سجے برتن، اُجلے اُجلے نیپکن اور مؤدب اور سر نگوں خادم۔

اکیڈمی کی یہی عیاشیاں کیڈٹ کو مارے ڈالتی ہیں اُس وقت جب آؤٹ ڈور ایکسرسائز یعنی فوجی مشقوں کے دوران سرہانہ اینٹ کا ہوتا ہے اور بستر زمین کا۔

پانی کی مقدار صرف ایک بوتل پر مشتمل ہوتی ہے اس سے شیو بنا لیجیے، پیاس بجھا لیجیے، ہاتھ منہ دھو لیجیے یا حلق میں کانٹے پڑنے کے بُرے وقتوں کے لیے سنبھال کر رکھ لیجیے۔

آج ہم آپ کو ایک ایسی ہی مشق کی رُوداد سنانے چلے ہیں۔ جس میں پی ایم اے کی حیا شیلوں میں ڈوبا کیڈٹ بے بسی کی تصویر بنا نظر آتا ہے۔ اکیڈمی ایک دو دنوں کے لیے نہیں، پورے پانچ دنوں کے لیے اس سے چھوٹ جاتی ہے۔ تصوریں کرنے کی بجائے قبرستان کی خموشیاں اس کا مسکن ہوتی ہیں۔ ڈرل گراؤنڈ میں بجتے بینڈ کی دلنواز موسیقی کی جگہ ندی نالوں کے کنارے بھنبھناتے مچھر اسے نئی سُروں سے نوازتے ہیں اور گیزر کے گرم پانی کی جگہ ندی نالوں میں بہتے یخ بستہ پانی سے اس کا نصیب لڑتا ہے۔ ہمارے دنوں میں اس مشق کو 'یرموک' کا نام دیا گیا تھا۔ مشق کیا تھی! —— کمر پر پٹھو جس میں دو کمبل اور چھوٹی موٹی کئی اشیاء کے علاوہ برساتی بھی ٹھنسی ہوئی تھی۔ دائیں جانب چھوٹا سا تھیلا جس میں پالش اور شیو کا سامان، تولیہ، کنگھا، شیشہ اور دیگر الابلا کہ تعداد جن کی چھتیس تک پہنچتی ہے، اور بائیں جانب پانی کی بوتل کہ مفلس کی جیب کی طرح خالی رہنا جس کا ہمیشہ سے مقدر ٹھہرا ہے۔ اس سازو سامان کے ساتھ بس ایک ہی شغل

—— چلنا چلنا، مدام چلنا!

آسمان کی نیلاہٹوں سے ابھی تاروں کی ردا کھنچنے نہ پاتی تھی کہ کیڈٹ زین میں کسے ہوئے چلنے کے لیے تیار ہو جاتے اور پھر سورج ڈوب جانے تک ان کا کام تھا حرکت میں رہنا۔ جب قدم ٹوٹ جاتے، چال لڑکھڑانے لگتی، کلیجہ اچھل کر منہ کو آنے لگتا اور زبان سوکھ کر کانٹا ہو جاتی تو کسی نالے کے کنارے کسی ٹوٹی دیوار کی اوٹ میں، یا کسی باغ کے گوشے میں دم بھر کو ذرا ٹھہر جاتے اور ابھی کمر سے بندھی بوتلوں کی شریب (پٹیاں) ڈھیلی نہ ہو پائیں کہ کوچ کا حکم مل جاتا۔ اسی تگ و دو کے عالم میں ایک ایک دو دو گھونٹ حلق میں لنڈھاتے چلتے چلتے بوتلیں سنبھالتے اور پھر وہی چال بے ڈھنگی —— اس پر مستزاد یہ کہ دائیں بائیں پلاٹون کمانڈر موجود رہتے جو چال میں 'صبا رفتاری' کی مقدار ذرا کم دیکھتے تو گلے کی تمام تر قوتیں بروئے کار لاتے ہوئے سرِ راہ بے عزتی پر اُتر آتے —— ہم شہری زندگی

کو خیر باد کہہ چکے تھے، جہاں سرِ راہے ملاقاتوں پر جانے کی کہانیاں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔

ہم جن سرِ راہے واقعات کا ذکر کر رہے ہیں ان میں بانہیں نہیں چٹکیاں چٹختی ہیں، دل نہیں جسم دُکھتا ہے۔ دل سلگتے نہیں، بخار کی تپش میں جلتے ہیں۔ جسموں کی گداز کا نہیں پیروں کی خرابی کا ذکر ملتا ہے۔ جھرنوں کے سبک گام ترانوں سے نہیں بوتل کے گرم پانی سے دل بہلایا جاتا ہے۔ دل کے پھپھولوں کا نہیں، پیروں کے چھالوں کا علاج سوجھتا ہے۔ کڑی دھوپ میں کسی رنگین آنچل کے سایوں کی نہیں، ناشلی کے پیڑوں کی تلاش ہوتی ہے۔ کسی ندیا کنارے پی سے ملن کی سندر آشا دل کو نہیں تڑپاتی، خالی بوتلوں کو جلدی سے لبریز کر لینے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں میں کسی مٹیار سے نہیں، پلاٹون کمانڈر سے ملاقات ہوتی ہے اور گھنے جنگلوں میں بل کھاتی پگڈنڈیوں کے موڑ پر پربتوں کی کوئی شہزادی نہیں، بٹالین کمانڈر کی جیپ کھڑی ملتی ہے۔

مشق کے پہلے روز دوپہر کا کھانا تو پراٹھوں اور انڈوں وغیرہ کی شکل میں کیڈٹ کی جیبوں میں ٹھنسا ہوتا ہے۔ تاہم شام کا کھانا صرف خشک راشن کی شکل میں ملتا ہے اور دن بھر کے سفر کے بعد جب پڑاؤ پر پہنچتے ہیں تو نہ صرف اپنے خیمے خود لگانے پڑتے ہیں بلکہ کھانا بھی خود پکانا پڑتا ہے۔ تھکن کے مارے بُرا حال ہو، بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہو اور آگ ہو کر جلنے کا نام نہ لے رہی ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کس مصیبت کا سامنا ہوتا ہوگا۔ شاید ہی کوئی کیڈٹ اس پکوان کے پکنے کا انتظار کرتا ہو۔ ذرا سا شبہ بھی ہو جائے کہ ہاں یہ پک گیا ہے تو اسے چٹ کر لیا جاتا ہے اور سونے کی فکر کی جاتی ہے۔ مشق کے دوران ہر کیڈٹ کو رات کے وقت دو دو گھنٹوں کے لیے سنتری کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔

پہلے دن کے پڑاؤ میں ہمارا گروپ چار کیڈٹوں پر مشتمل تھا۔ ہم دو کیڈٹوں نے بیوک (دو دو آدمیوں کے سونے کے لیے چھوٹے خیمے) لگانا اور بستر بچھانا اپنے ذمے لیا۔ ایک نے امورِ خانہ داری کا بیڑا اٹھایا اور چوتھا پلاٹون لائن برقرار رکھنے کا ذمہ دار ٹھہرا۔ آگ جلانے کے لیے خشک لکڑیاں اور دریا سے پانی لانا اس کا کام تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا، اندھیرے کا عالم اور کڑاکے کی سردی، دانت سے دانت بج رہے تھے۔ تھکن اور خستگی کے مارے جسم کا بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوا الگ ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہم بمشکل خیمے اور چوبیں اٹھا کر لائے۔ خیموں کو زمین پر پھیلایا اور چوبوں کو گاڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ساتھی نے جلدی میں ہتھوڑا چلایا ——— تو ...... اُف ...... سی ...... سی ...... سائیں سائیں، شائیں شائیں ——— آنکھوں کے سامنے اندھیرا تو پہلے سے موجود تھا، تارے اب ناچنے لگے۔ کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ حواس بجا ہوتے تو ہاتھ کو بغل میں دبا پایا ——— اب یہ موسیٰؑ کا ہاتھ تو تھا نہیں کہ بغل سے نکالتے تو روشن روشن پاتے، کیڈٹ کا ہاتھ تھا جس نے خیمے لگانے کے بعد بھی بہت سے کام کرنا تھے۔

خدا خدا کر کے ان کی تنصیب مکمل ہوئی۔ اب ہم خیموں میں داخل ہوئے۔ بارش کی وجہ سے زمین گیلی تھی۔ ایک جانب ٹوٹی پھوٹی اینٹوں، پتھروں اور مٹی کا ایک ڈھیر سا بنا پایا۔ اس ڈھیر نے سرہانے کا کام دینا تھا۔ پھر سب سے پہلے برساتیاں بچھائیں کہ زمین کی نمی جسم تک نہ پہنچے، پھر کمبل بچھائے۔ لیٹ کر دیکھا، بستر تو آرام دہ تھے لیکن جسم کو برمائی چھوتی ہوا برابر اندر چلی آتی تھی۔ اٹھے اور چاروں جانب سے تھوڑی تھوڑی مٹی کھود کر خیمے کی چادروں کے کنارے مٹی میں دبا دیئے۔ ہوا کی آمد و رفت تو بند ہو گئی لیکن سیلی ہوئی زمین کی ٹھنڈک کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ اب صبح کی فکر دامن گیر ہوئی۔ جوتے کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے۔ انھیں صاف کیا۔ پالش کی ڈبیا تلاش کی اور جوتے چمکانے لگے۔ وہ تو خیر کیا چمکتے، بلکی بھوک اور چمک اٹھی۔ پالش کرنے کے عمل سے جسم میں کچھ حرارت سی بھی پیدا ہو گئی۔ جوتوں کو ایک طرف جمایا اور شیو کا سامان ڈھونڈ ڈھانڈ کر ترتیب سے رکھا کہ صبح دقت نہ پیش آئے۔ سب کام مکمل کر کے باہر والوں کو آواز دی کہ بستر تیار ہیں کھانا تیار ہو تو اندر لے آئیں۔ جواب سن کر ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ وہ جو لکڑیاں چننے گیا تھا ابھی تک واپس نہیں آیا

تھا۔ مرتے کیا نہ کرتے۔ باہر نکلے۔ خدا خدا کر کے کچھ لکڑیاں اور چوتھے ساتھی کو تلاش کیا۔ بارش کی وجہ سے سوکھی لکڑیاں تو ویسے ہی عنقا تھیں۔ ہوا کی وجہ سے گیلی لکڑیوں کے سلگنے کی نوبت بھی نہ آ رہی تھی ——— ہم ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے اور درمیان میں آگ سلگانے کی کوشش کرنے لگے۔ آگ جل اٹھی تو کھانا پکانے کی سوجھی۔ معلوم ہوا کہ امورِ خانہ داری میں ہم چاروں ایم اے ہوم اکنامکس ہیں۔ ایک کہتا تھا، "پہلے گھی کو بھونو۔ لال ہونے پر آئے تو اس میں مصالحے ڈال دو ......" دوسرے نے ٹوکا، "گھی سے تو تڑکا لگاتے ہیں۔ پہلے مرچیں بھونتے ہیں۔ لال ہونے پر آئیں تو باقی چیزیں ڈالتے ہیں۔" تیسرے نے موشگافی کی "مرچیں تو پہلے ہی لال ہوتی ہیں۔ ان کا کیا لال کرنا۔ تم سب کورے ہو۔ میری سنو لہسن اور پیاز کو باریک کتر لو۔ تمام مصالحے یکساں مقدار میں لو۔ ان مصالحوں اور پیاز کو گھی میں ڈال کر بھونو۔ جب دونوں چیزیں یک جان و یک رنگ ہو جائیں تو باقی چیزیں ڈال دو۔ دس منٹ بعد اتار لو۔ ٹھنڈا ہونے پر پیش کریں۔ نہایت لذیذ ہو گا۔" ہم سب ان کے علم امورِ خانہ داری سے بہت متاثر ہوئے۔ تاہم ہم نے بھی اپنی ناچیز رائے کا اظہار کیا، "پانی ذرا کم ڈالنا۔ شوربہ گاڑھا ہی اچھا لگتا ہے اور ہاں نمک ڈالتے ہوئے احتیاط کرنا۔ زیادہ پڑ گیا تو سالن کی لذت جاتی رہے گی۔" سب نے اس پر صاد کیا۔

جب امورِ خانہ داری کی تمام ان ترکیبوں پر جو ممکن تھیں بحث مکمل ہو گئی تو ان تھیلیوں کو ٹٹولا گیا جس میں راشن موجود تھا تاکہ معلوم کریں ان میں ہے کیا جسے [illegible] کر ہم پکانا چاہتے ہیں۔

ایک نے ایک تھیلی الٹی، چاول زمین پر بکھر گئے۔ پہلے تو اس کیڈٹ کے حسب نسب پر روشنی ڈالی گئی پھر سب نے مل کر بکھرے ہوئے چاول اٹھائے۔ باقی تھیلیوں میں سے گوشت، دالیں برآمد ہوئیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ یہ تو کھچڑی وغیرہ پکانے کا سامان ہے۔ اس کی ترتیب و ترکیب کیا ہو۔ آخر سب ایک تجویز پر متفق ہو گئے کہ سب کچھ بیک وقت پتیلے میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا جائے۔ جب چاول

اور وہ ابھی کل بہتیری تو مان لیا جائے کہ کھانا تیار ہے۔ مرچ مسالے کے بارے میں ہم نے فرض کر لیا کہ وہ اسی نسبت سے مہیا کیے گئے ہوں گے جو ضروری ہے۔ اندھیرا تو تھا ہی بغیر دیکھے بھالے ہم نے پلاسٹک کی تمام تھیلیاں میس ٹن میں اُلٹ دیں۔ اسے پانی سے بھرا اور چولہے پر چڑھا دیا۔ اب ساری کوششیں اسی بات پر مرکوز تھیں کہ آگ برابر جلتی رہے۔ چاروں کیڈٹ چولہے کو ہوا سے بچانے جڑے بیٹھے تھے۔ ہم سب کبھی آگ کو دیکھتے، کبھی پکوان کو —— کہ اچانک ایک کیڈٹ نے گھبرائی گھبرائی آواز میں کہا، "او...... دیکھو...... وہ ایک تھیلی...... ایک تھیلی"

"سب تھیلیاں ڈال دی ہیں۔ بھول جاؤ انہیں۔ آگ کی فکر کرو۔" پھونکیں مارتا کیڈٹ پھنکارا۔

"لیکن...... لیکن...... میری بات تو سنو......" پہلا کیڈٹ ممیایا۔

"یار کہہ چکو جو کہنا ہے" ایک اور نے حوصلہ افزائی کی۔

"او دیکھو...... مجھے یاد آیا...... ایک تھیلی میں آٹا بھی تھا۔"

"کیا آآآ؟" ہم سب میس ٹن پر جھک گئے۔

پہلے بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ آٹے کی تھیلی بھی کھچڑی میں شامل ہو گئی تھی۔ کوئی اور چارہ باقی نہ تھا۔ آگ جلاتے رہے۔ کچھ دیر بعد کسی نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ اختلافِ رائے کی گنجائش تھی نہ ہمت۔ سب نے اس کی بات مان لی اور چمچوں سے اس پر پل پڑے۔ ذائقے میں دھوئیں کی کڑواہٹ اور کسیلا پن، آٹے کی ٹھٹلیاں، کچھ کرکراہٹ، سبھی کچھ شامل تھا لیکن کھانے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ اس ملغوبے کو جسے بعد میں ہم نے آٹے کی کھچڑی کا نام دیا، بڑے شوق سے کھایا اور خیموں میں گھس گئے —— ایک کیڈٹ نے شکایت کی کہ اس کے سرہانے گیلی گیلی کوئی چیز ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا، گھی ہے جو پکوان میں ڈالنے کی بجائے وہیں دھرا رہ گیا تھا۔

سونے کی تیاری کی۔ بڑے تھیلے میں جتنے بھی کپڑے موجود تھے پہن ڈالے،

ڈانگری، ڈانگری سے نیچے جرسی، دونوں جرابیں اونی دستانے اور کانوں پر مفلر، ہاتھ بغلوں میں دابے، گھٹنے پیٹ سے جوڑے، رائفل کو گلے لگایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ (کیڈٹ دل کھو سکتا ہے، جان کھو سکتا ہے —— رائفل نہیں کھو سکتا)۔

لیٹ تو گئے لیکن سردی رُکے تو کیونکر؟ پہلے تو کسمساتے رہے پھر ساتھی کو آواز دی۔ وہ بھی پہلو بدل رہا تھا۔ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ "بھئی یہ سردی ایسے تو رکنے سے رہی —— پھر؟" تھوڑی دیر میں ہم نے دو بستروں کو ایک بستر میں بدل دیا۔ اب ہمارے نیچے ایک کی بجائے دو برساتیاں اور دو کمبل تھے۔ اوپر بھی دو کمبل اوڑھے تھے۔ کچھ جان میں جان آئی۔ ابھی کچھ غنودگی سی ہی طاری ہوئی تھی کہ باہر سے سیکشن کمانڈر کا حکم سُنائی دیا۔ دو گھنٹے بعد ہمیں سنتری کی ڈیوٹی دینا ہوگی۔ ہمارے احتجاج سے پیشتر ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کسی اور طرف روانہ ہو گیا۔ ہم نے گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی۔ آدھی رات کا عمل تھا۔ گویا دو سے چار بجے تک ہمیں ڈیوٹی دینا تھی۔

کسی کی تیز تیز باتوں سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ ہم سے پہلے والا سنتری ہمارے ساتھ کے خیمے سے اشفاق کو جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ خیمے کے مکین اسے بتا رہے ہیں کہ اشفاق یہاں نہیں ہے لیکن سنتری ہے کہ اشفاق کو وہیں سے برآمد کرنے پر مُصر ہے —— سنتری کی جھنجلاہٹ اور نیند کے متوالوں کی بڑبڑاہٹ ہم نے باہر نکل کر ختم کی۔

اس رات ہمیں معلوم ہوا کہ اندھیرے کے کیا کیا روپ ہیں اور بہتا دریا کہ جس کے پانیوں سے ہمیشہ نظر کو طراوت ملتی ہے، رات کے وقت کیوں کر گرجتے دھاڑتے دھاروں میں بدل جاتا ہے۔ ایسے سناٹے، یہ ویرانیاں اور وحشتوں کا یہ عالم ——؟ اس سے پہلے ہم نے کب دیکھا تھا ——؟ رات یونیورسٹی میں بھی آتی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک چاند ہوتا تھا جو سرو اور چناروں کے پیڑوں کے پیچھے سے ساری رات آنکھ مچولی کھیلتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ بہت سے چاند شہر کے کنارے بھی طلوع

ہوتے تھے۔ تب نہر کا پانی ساری رات جگ مگ کرتا ہم سُروں میں پیار کے گیت گاتا رہتا تھا ——— لیکن . . . . . . یہ رات . . . . . . ؟ یہ اندھیرے . . . . . . ؟ ہُو کا یہ عالم ؟ ہر جھاڑی ہم سے "کون ہے" کہتی دکھائی دیتی۔ نظر پھیر کر ہم دریا کو تکتے تو وہاں سے گھن گرج سُنائی دیتی۔ ایسا لگتا بانسوں لمبے لمبے انسان آسمان کی جانب سے دریا میں اُتر رہے ہیں۔ وہ پانی پیتے لال لال زبان ہونٹوں پر پھیرتے اور گھناؤنے چہروں سے قہقہے لگاتے ہماری طرف تکتے۔ ہم سر کو جھٹکتے، آنکھیں جھپکتے اور دِل بہلانے ہی کو ہوتے تو یہ کمبخت غائب ہو جاتے۔ جنگل کی طرف دیکھتے تو شیروں، ہاتھیوں اور بھیڑیوں کے سائے منڈلاتے دکھائی دیتے۔ پتہ بھی ہلتا تو دل لرز اُٹھتا ——— اور رواں دل پکارتا، "کون ؟" ——— آہستہ آہستہ خوف جاتا رہا اور نیند ٹوٹنے لگی۔ ڈیوٹی کا وقت ختم ہُوا تو ایک اور کیڈٹ کو جگایا اور خود اپنے خیمے میں جا کر فوراً ہی دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

صبح سویرے سورج نکلنے میں ابھی بہت دیر تھی جب آنکھوں میں ٹوٹتی نیندوں کا خمار لیے ہم نے خیمے اکھاڑ ڈالے۔ ناشتہ ——— ؟ ڈبل روٹی کے یخ توس جنہیں گھی میں تلا گیا تھا اور چائے! اُبلتے ہوئے یقیناً گرم ہوتی ہو گی لیکن ہمارے گلوں میں آتے تک محبوب کے رویّے کی طرح سرد ہو چکی تھی، جسم کو کیا لگاتی ؟ توس تو چبائے نہ گئے چائے کو حلق سے انڈیلا اور اپنے اپنے بوجھ صلیبوں کی طرح اُٹھائے آئندہ منزل کی طرف کوچ کے لیے تیار ہو گئے۔

منزلوں پر منزلیں مارتے، راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کرتے بالآخر مشق کا آخری روز آ پہنچا۔ اس دن کیڈٹوں کو مختلف سیکشنوں میں بانٹ کر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے منزل متعین کر دی جاتی ہے، راستے میں دو ایک جگہوں کو کنٹرول پوائنٹ قرار دیا جاتا ہے یعنی کیڈٹ جو راہیں چاہے اختیار کریں لیکن کنٹرول پوائنٹ سے ٹِک حاصل کرنا ضروری ہے۔

ہمارے ساتھ بدقسمتی یہ ہوئی کہ مشق کے اس آخری روز جبکہ کیڈٹوں کی خستہ حالی اپنے

عروج پر تھی ہمیں ایک سیکشن کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ ہمارے انڈر کمانڈ آنے والے کیڈٹوں میں کوئی طول میں کم تھا تو عرض میں زیادہ تھا۔ کوئی متناسب الاعضا تھا تو دل چھوڑے بیٹھا تھا، ایک کیڈٹ کے آبلے اسے چلنے نہ دیتے تھے تو ایک اور کیڈٹ گندے ندی نالوں کا پانی پی پی کر عمل انہضام تیز کر بیٹھا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سیکشن ذرا تیز چلتا تو موصوف غائب ہو جاتے۔ تلاش کرنے پر کسی جھاڑی کے پیچھے یا درخت کی آڑ سے نکلتے پائے جاتے۔ وُہ شاملِ سیکشن ہوتے تو ایک اور کیڈٹ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے جھکتا چلا جاتا اور یُوں پُورے کا پُورا سیکشن جگہ جگہ ڈیرے ڈال دیتا۔

اس سے پہلے کے دنوں میں پلاٹون کمانڈر ساتھ تھے۔ چال میں ذرا لڑکھڑاہٹ ہوتی تو ان کی رُوح فرسا آواز بلند ہوتی اور کیڈٹ سب دُکھ درد بھلا کر پھر صبا رفتار ہو جاتے لیکن آج کیڈٹوں کی بن آئی تھی۔ کیڈٹ ہی کمانڈر تھے اور کیڈٹ ہی انڈر کمانڈ چنانچہ منزل کو پا لینے کی تمنا تو تھی لیکن اب اس کے لیے باقاعدہ آبلہ پائی کی جائے، یہ کسی کو گوارا نہ تھا۔ خواہ مخواہ دوڑ دوڑ کر پیروں کا ستیاناس کیا جائے، اس کا کسی میں یارا نہ تھا۔ بلاوجہ سانسیں پھلائی جائیں، دھڑکنیں منتشر کی جائیں ——— فائدہ اس زیاں میں کچھ تھا ؟ چنانچہ شروع شروع میں تو سب نے تیزی دکھائی لیکن جب کیمپ پیچھے رہ گیا اور کیڈٹ پلاٹون کمانڈروں کی زد سے باہر آ گئے تو چلنے کے انداز بدل گئے۔ ذرا بے دم ہوئے تو کسی پیڑ کی چھاؤں میں پڑ رہے۔ سیکشن کمانڈر چیخ رہا ہے کہ خدا کے لیے اُٹھو، دیر ہو رہی ہے۔ اسے نصیحت کی جاتی ہے کہ وُہ نقشے کا مطالعہ کرے اور راہیں ٹھیک ٹھیک متعین کرے، کہیں ایسا نہ ہو کر پُورے سیکشن کو لے کر راستہ بھول جائے اب وُہ لاکھ چیخے کہ مطالعہ میں رات بھر کرتا رہا ہُوں اب چلنے کی بات کرو، اس کے لیے حکم یہی ہے کہ وُہ مزید مطالعہ کرے۔

اس خستہ حالی میں ایک آبادی کے قریب سے گزر ہُوا۔ گاؤں کے بچے بالے ہمیں دیکھ کر جمع ہو گئے۔ ان کے چہروں سے مسرت اور حیرانی یُوں پھُوٹی پڑتی تھی جیسے اُونٹ کے بعد ہم ہی انھیں عجیب الخلقت نظر آئے ہوں۔ ہم سر جھکائے گزر رہے تھے کہ

ایک بوڑھی عورت کی آواز آئی "ہائے ہائے، کیسی کیسی ماؤں کے لعل ہیں لیکن وطن کے لیے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔"

احساسِ تفاخر ابھی پوری طرح ذہن میں سمایا نہ تھا کہ ایک اور آواز آئی ــــ "بچے پڑھ لکھ جاندے تے ایہہ حال نہ ہوندا" (اگر پڑھ لکھ جاتے تو یہ حال نہ ہوتا) اور پورے کا پورا سیکشن جس کا ہر فرد کم از کم گریجوایٹ تھا، ہنسی کا گول گپا بن گیا۔ کچھ کیڈٹوں نے کمانڈر کو بھی ہنستے پایا۔ تو تپ گئے۔ بچوں سے کہا کہ پیاس لگی ہے۔ وہ بھاگے بھاگے گئے اور لسی سے لبالب برتن لے آئے۔

ہم کہ اس سیکشن کو بسلامت کیمپ تک پہنچانے کے ذمہ دار قرار پائے تھے۔ حیران و پریشان کہ اگر رفتار کا یہی عالم رہا تو پہنچ لیے ہم کیمپ۔ سوچا کہ ایک عدد تقریرِ دلپذیر سے جوانوں کے حوصلے بڑھائے جائیں۔ پوچھا:

ط "اس ٹوٹے پھوٹے سیکشن میں منزل کی تمنا کس کو ہے؟"

جواب ملا: "چھوڑیں جی! پہنچ جائیں گے ہم پہنچتے پہنچتے گویا

ط "اب ایسی شکستہ راہوں پہ منزل کی تمنا کون کرے۔"

ہم نے سر پیٹ لیا۔ ان سے مغز ماری کرنا بھینس کے آگے بین بجانے سے زیادہ فضول شغل نظر آیا۔ ادھر نقشے کو دیکھ دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی کہ ابھی راستے میں آسمان سے باتیں کرتی ایک بلندی تھی کہ نام جس کا "گمگی چوٹی" اور اونچائی جس کی ہزاروں فٹ تک پہنچتی تھی۔ نہایت سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر اس چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کی گئی تو اپنا سر سلامت نہیں رہے گا۔

چنانچہ جب سیکشن پاؤں پسارے محوِ استراحت تھا ہم نے واقعی نقشے کا مطالعہ مزید شروع کیا اور بڑی عرق ریزی سے کیمپ تک پہنچنے کا ایک اور روٹ ڈھونڈ نکالا۔ شاید کولمبس کو امریکہ دریافت کرکے اتنی خوشی نہ ملی ہو جتنی ہمیں "گمگی چوٹی" سے نہ گزرنے والا راستہ دریافت کرکے ہوئی۔ سیکشن کو یہ مژدہ جانفزا سنایا تو اکثریت نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ کہیں راستہ نہ بھول جائیں کیونکہ چلتے وقت ہدایت کی گئی تھی

کہ اگر گمگی چوٹی کے دائیں بائیں سے گزرنے کی کوشش کی گئی تو راہیں بھول جاؤ گے۔ ہم نے اپنی نقشہ دانی پر اعتماد کرتے ہوئے سیکشن کو حکم دیا کہ وہ چون و چرا ختم اور سرِ تسلیم خم کریں۔ وہ کچھ دور تو گڑگڑاتے رہے لیکن جب واپسی کے امکانات معدوم ہو گئے تو ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہوئی کہ کہیں راستہ نہ بھول جائیں۔

راستہ واقعی نہ بھولے اور جب سرِ شام ہم پہاڑوں کی بھول بھلیوں سے نمودار ہوئے تو دور نیچے ایک میدان میں سفید سفید پٹیاں سی نظر آئیں۔ چہروں پر تھکنیں لیے دور بینوں کا سہارا لیا تو بے ساختہ چلا اٹھے۔ پہاڑ ہمارے نعروں سے گونج اٹھے۔ یہ ہمارا کیمپ تھا۔ ہماری منزل۔ ایک جانب خیمے ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً کھانا پک رہا تھا۔ ایک اور طرف گاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ ان میں بیٹھ کر ہم نے واپس اکیڈمی پہنچنا تھا۔ کتنی ہی دیر یہ روح افزا منظر دیکھا کیے اور تصور ہی تصور میں کیمپ پہنچ گئے جہاں گرم گرم چائے ہماری منتظر تھی۔ اور خوش ذائقہ کھانا ہمارے لیے بے تاب۔

منزل کو قریب پا کر ساری کلفتیں دور ہو گئیں اور پورا سیکشن ہنستا گاتا نیچے اترنے لگا۔ خوش مزاجی لوٹ آئی۔ گیت گائے جانے لگے۔ ایک کیڈٹ نے ترنگ میں آ کر لکڑی کی بنی ہوئی رائفل ہی نیچے پھینک دی کہ اتر کر اٹھا لیں گے۔ وقتی طور پر تو موصوف بہت خوش ہوئے کہ اس ترکیب سے کچھ دیر کے لیے تو رائفل کے بوجھ سے نجات مل گئی لیکن جب نیچے اترے تو دیکھا کہ پتھروں نے رائفل سے لکڑی کی ایک کھپچی علیحدہ کر دی ہے۔ ظاہر ہے ساری خوش مزاجی رخصت ہو گئی۔ اب ان کی پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ کوئی بڑھئی مل جائے جو رائفل کو اس طرح ٹھیک کر دے کہ بالکل محسوس نہ ہو کہ اس کی مرمت کی گئی ہے۔ بڑھئی تو نہ مل سکا، البتہ ایک موچی مل گیا جس نے کمال مہربانی سے جوتوں سے توجہ ہٹا کر رائفل پر "دستِ ہتھوڑی" دراز کیا۔ اور ہماری جان میں جان آئی۔

پہاڑ سے نیچے اترے تو "میرن ناڑہ" اپنی تمام تر جولانیوں سمیت رواں دواں

نظر آیا ہم گمری چوٹی سے نزول فرماتے تو یہ نالہ (جانے کس بے وقوف نے اس بھاگتے ہوئے دریا کا نام نالہ رکھ چھوڑا ہے) کہ اس کا کرنا آسان ہوتا لیکن یہاں تو نقشے پر اس کی گہرائی وہم سے سوفٹ تک نظر آتی تھی جس جگہ اسے عبور کرنے کے قابل (Foldable) دکھایا گیا تھا اس کی نشاندہی بھی ہیں ہم سب متفق تو تھے لیکن طوفانی لہروں کے سامنے نقشے پر ایمان لاتے ہوئے دل بیٹھ رہا تھا سو فیصلہ یہ ہوا کہ فی الحال اس گنگا کی موجوں کا نظارہ کیا جائے۔ ساتھ کے گاؤں سے کوئی تو جائے گا اس پار یا دن بھر کی محنت مشقت کے بعد کوئی تو سے

گھر کو لوٹ رہا ہوگا بے وفا

جہاں سے وہ اترے گا، وہیں سے ہم بھی پار اتر جائیں گے۔

ہماری خواہش جلد ہی پوری ہو گئی لیکن فدا کیسی ہو کر۔ نالہ پار کرنے آیا تو کون؟ ایک الھڑ دوشیزہ! اس کا سرپرست بھی ساتھ تھا لیکن نقوشِ پا اسی کے زیادہ معتبر نظر آئے۔ اب ہوا یہ کہ وہ تو پانچے سرکائی، کچھ شرمائی، کچھ مسکرائی اور گئی پار اور ہم رہ گئے بیچ منجدھار۔ اب حال یہ ہے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ بیچ میں کھڑے ہیں پانی قدموں کو اکھاڑے ڈالتا ہے۔ لہروں کو دیکھیں تو سر چکراتا ہے، ساحل کو دیکھیں تو جی گھبراتا ہے۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ آخر ہم نے اپنے اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے پاٹ دار آواز میں کہ شدید و تند لہروں پر حاوی ہو کر سنی جا سکے حکم دیا ——

"ایڈوانس!"

اور اس کے ساتھ ہی ایک کیڈٹ شڑاپ سے گرا اور آناً فاناً بہتا چلا گیا۔ ہم سب کے پیروں تلے کی زمین تو پہلے ہی نکلی جا رہی تھی جان بھی نکلنے لگی لیکن بچنے کا یارا کسی میں نہ تھا۔ یہ محض ایک غیبی امداد تھی کہ نیچے کے بہاؤ کی طرف ایک اور کیڈٹ اپنے پاؤں جمانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ یہ بہتا کیڈٹ اس کی ٹانگوں سے ٹکرایا تو وہیں لپٹ گیا۔ دوسرے کیڈٹ آہستہ آہستہ وہیں سمٹ گئے۔ اب اسے سب مل کر اٹھا رہے ہیں لیکن وہ لیٹنے کو زور لگا رہا ہے۔ اسے ڈانٹ پلائی کہ لیٹنا ہی ہے تو کنارے جا کر لیٹ جاؤ، یہاں سے تو اٹھو۔ کسی نے سمجھایا کہ کبھی وہ اٹھے تو کیونکر، اس کی کمر پر لدے ہوئے جودو کمبل بھیگ کر

منوں سے ٹنوں میں بدل گئے ہیں تب ہمیں اس کی بیچارگی کا احساس ہوا۔

وقت مشکل کے سنا کرتے ہیں ٹل جاتے ہیں

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوٹ لوٹ آتے ہیں۔ خدا خدا کر کے کیمپ پہنچنا نصیب ہوا۔ تو سب سے پہلا سوال جو ایک افسر نے کیا۔ یہ تھا کہ گمری چوٹی سے حاصل کیا ہوا تو کس کی طرف؟ ہم نے بتایا کہ ہم نے تو گمری چوٹی کا رخ ہی نہیں کیا۔ بس بجائے اس کے کہ گرم چائے سے ہماری تواضع کی جاتی، پورے سیکشن کو فالن کر دیا گیا۔ ہم کہ کمانڈر تھے سیکشن کی بائیں جانب کھڑے ہو گئے۔ ایک سینیئر افسر نے کہ ٹرم کمانڈر Term commander کہلاتے تھے، دائیں سے پوچھنا شروع کیا: "کیا میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہیں گمری چوٹی پر سے ضرور گزر کر جانا چاہیے ——— ورنہ راستہ بھول جاؤ گے۔"

ایک کیڈٹ نے جواب دیا "جی بالکل!"

"پھر تم نے راستہ کیوں بدلا؟"

"جی ہم سمجھے کہ اگر راستہ بھولنے کا خدشہ نہ ہو تو گمری چوٹی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔"

"ہوں، تمہاری سمجھ کا علاج! فرنٹ رول کیری آن!"

پتھریلی زمین، سارے دن کی تھکن، انسانوں کی طرح ٹانگوں پر کھڑا ہونا مشکل اور بیچارہ کیڈٹ سر کے بل قلابازیوں میں مصروف۔ ہمیں اپنی کمانڈری کے صدقے اپنا مستقبل قریب صاف نظر آ رہا تھا۔

دو ایک اور کیڈٹوں سے پوچھ گچھ ہوئی۔ ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ پھر اچانک ٹرم کمانڈر کو خیال آیا کہ ان کے کمانڈر سے تفتیش ہونا ضروری ہے۔ سو درمیان کے کیڈٹوں کو چھوڑ کر وہ سیدھے ہماری جانب بڑھ آئے۔ ہم اب تک کتنی دلیلیں سوچ چکے تھے۔ گمری چوٹی نہ جانے کی۔ مگر ان کے سامنے سب بودی نظر آ رہی تھیں۔ سو سیدھے سادے طریقے سے اقرار کر لیا: "سر! یہ میری غلطی تھی۔ میں نے بریفنگ غور سے نہیں سنی اور یہ بھول گیا کہ گمری چوٹی کنٹرول پوائنٹ ہے۔"

ٹرم کمانڈر کو شاید غلطی تسلیم کر لینے کی یہ ادا پسند آ گئی۔ انھوں نے ہمیں بخش دیا اور محض انگریزی کے شعلے سے نوازنے پر اکتفا کیا۔ واقعہ چھوٹا سا ہے۔ لیکن اس دن ہم نے یہ سبق سیکھا کہ فوج میں رہ کر کٹ حجتی، بحث اور جھوٹے سچے دلائل سب بیکار ہیں۔ آرڈر سنو غور کے ساتھ اسے پورا کرو پوری لگن کے ساتھ لیکن تکمیل نہ ہو سکے یا کوئی کوتاہی ہو جائے تو بلا جھجک اپنی غلطی تسلیم کر لو۔

قلابازیاں لگاتے کیڈٹوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ گگری چھوٹی نہ جانے کا الزام ہم نے ان کے سر تھوپ دیا ہے۔ بعد میں انھیں صورتِ حال بتائی گئی تو غلط فہمی رفع ہوئی۔

چیتی جھنگلت کر واپس آئے تو تھکن کے مارے بُرا حال تھا۔ یہ آخری رات تھی جو ہمیں کھلے آسمان تلے گزارنا تھی۔ دوسرے روز اکیڈمی پہنچ جانا تھا لیکن پہاڑ جیسی رات یخ بستہ خیمے میں بسر کرنے کے تصور ہی سے دل بیٹھا جاتا تھا۔ بس یہی چاہتا تھا کہ گھڑی کی چوتھائی میں پی ایم اے پہنچ جائیں اور نہا دھو کر لمبی تان کر سو جائیں ؎

اے صبا آرزو کہ خاک شدہ

اچانک یہ خبر سنائی گئی کہ کیمپ فائر منعقد کیا جا رہا ہے۔ یہ خبر سن کر ہی ساری تھکن جاتی رہی۔ پھر روشن آگ کے ایک بڑے الاؤ کے اردگرد بیٹھ کر رات گئے راگ رنگ کی جو محفل جمی اس نے فرار ہوتے حوصلوں کے قدم پھر مضبوط کر دیے۔ محفل کیا تھی دل کے پھپھولوں کا برملا اظہار۔ کسی نے کیڈٹ پر ہونے والی "شفقتوں" کو مزاحیہ نظم کے اشعار میں پرو دیا تھا تو کسی نے پلاٹون کمانڈروں کے انداز [illegible] طباعی کو نثر کی صورت میں بیان کیا تھا۔ کسی نے ڈرل انسٹرکٹروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو کسی نے پی ٹی انسٹرکٹروں کو واپس یونٹوں میں بھیجنے کی فریاد کی۔ رات بھیگنے تک فضاؤں میں قہقہے بکھرتے رہے۔

دلِ مُردہ دل نہیں ہے . . .

دوسرے روز اکیڈمی پہنچے۔ بسوں سے اتر کر ہمارا ارادہ سیدھا کمروں کی جانب جانے کا تھا لیکن بسوں کو گھیر رکھا تھا ڈرل انسٹرکٹروں نے۔ نیچے اترتے ہی انھوں نے ہمیں فال ان کیا اور لیفٹ رائٹ کراتے ہوئے سیدھا ڈرل سکیئر میں لے گئے۔ تمام سامان پشت پر لدا ہوا تھا۔ تھکن سے ہم لڑکھڑاتے جاتے تھے لیکن سٹاف تھے کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے ہوتے تھے۔ "صاب بازو پورا اٹھائیں، گھٹنا بیلٹ لیول تک اٹھائیں۔" ہم حیران ہو کر کبھی اپنے بازوؤں کو دیکھتے اور کبھی پریشان ہو کر صوبیدار میجر کی طرف۔ ڈرل کروانے کا نشہ یہ کسی اور وقت نہیں پورا کر سکتے؟ خدا خدا کر کے ڈرل سے جان چھوٹی لیکن کمروں میں جانے کی اجازت اب بھی نہیں تھی۔ حکم تھا کہ پہلے رائفلوں کی صفائی ہوگی۔ فوجی کی زندگی میں اس بات کو ایمان کا درجہ حاصل ہے کہ وہ خود کتنا ہی خستہ کیوں نہ ہو اس کا ہتھیار ہر وقت تر و تازہ رہنا چاہیے۔ رائفلوں کی صفائی کر کے کمروں میں پہنچے تو ہمیں بستروں سے دور رکھنے کا ایک اور بہانہ بنایا گیا۔ یہ دلچسپ بھی تھا اور کامیاب بھی۔

سینیئروں نے بتایا کہ ریسوک مشق کے اختتام کی روایت ہے کہ تمام سینیئر کیڈٹ چند گھنٹوں کے لیے خود کو جونیئر قرار دے دیتے ہیں اور جونیئر کیڈٹوں کو اختیار ہوتا ہے کہ ان سے جو چاہیں سلوک کریں۔ اعلان کیا گیا کہ تمام سینیئر کیڈٹ شام سات بجے تک جونیئر رہیں گے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام جونیئر کیڈٹوں میں پھیل گئی۔ بس پھر کیا تھا کسی کو یاد نہ رہا کہ گزشتہ پانچ دنوں کی صحرا نوردی نے پیروں میں آبلے ڈال رکھے

ہیں ان کا علاج کیا جائے۔ نیندیں حرام ہونے سے آنکھیں خمار آلودہ ہیں بستر کو مسکن بنایا جائے۔ بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ اس مختصر سی مہلت میں سینیئر کیڈٹوں کو اس سلوک سے نواز دیا جائے جو انھوں نے ہم پر روا رکھا تھا۔

ایک کمپنی کا کیڈٹ سی ایس ایم (کمپنی سارجنٹ میجر) ہاتھ آگیا۔ موصوف کمپنی میں ڈسپلن قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے بلحاظِ عہدہ ان کی زبان میں تھوڑی سی ترشی ضروری ہے اور آنکھوں میں سُرخ ڈوروں کا ہونا معمولی بات۔ لیکن یہاں سوال یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی حرکتوں میں حق بجانب تھے یا نہیں' ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ان سینیئروں میں شامل تھے جنھیں آج جونیئر قرار دے دیا گیا تھا۔ کسی کو یاد نہ رہا کہ چند گھنٹوں بعد انھیں پھر سی ایس ایم کے رُوپ میں آجانا ہے۔

جونیئر کیڈٹوں نے درزی کے تعاون سے کچھ رنگین کپڑے اُدھار منگوائے۔ سی ایس ایم کو پہنائے گئے' رخساروں پر غازہ' ہونٹوں پر سُرخی اور آنکھوں میں کاجل لگایا گیا۔ اور پھر آنکھوں پر عینکیں چڑھا انھیں کمپنی میں گھمایا گیا۔ اس ساری تیاری کے دوران ایک شور تھا کہ کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا۔ جونیئر کیڈٹ اُمڈے چلے آتے تھے۔ کوئی اس "نازنین" کے آٹوگراف لینے کو ٹوٹا پڑتا تھا' کوئی اس سے شام کی کسی حسین ساعت میں مونالیزا ریسٹورنٹ میں ملنے کا وعدہ لینے پر بضد تھا۔ کوئی اس کے لیے "سچا نجرا" منگا دینے کو تیار تھا بشرطیکہ وہ "ہاں" کرلے اور کوئی اس کے مرعوب پرکشش ہو جانے کو زندگی کی آخری خواہش قرار دے رہا تھا۔ بے چاری دوشیزہ مگر کبھی اس مضطرب کو دیکھتی جو چیخ چیخ کر اپنی وفاؤں کا یقین دلا رہا تھا تو کبھی اس مرغِ بسمل کو' کہ اس کے قدموں میں لوٹا جاتا تھا اور پکار پکار کہتا تھا ؎

اکیلے نہ جانا' ہمیں چھوڑ کر تم
تمھارے بنا ہم' بھلا کیا جئیں گے

ہاں سینیئر کیڈٹوں کے حلیے تو بدلتے رہے لیکن سی ایس ایم کی دوشیزگی کو آخر وقت تک برقرار رکھا گیا۔

ہم ابھی اسی چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے کہ ایک ساتھی بازو پکڑ' ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا کہ آؤ تمھیں ایک کمپیوٹر دکھائیں۔ دیکھا ایک سینیئر کیڈٹ ایک کونے میں سُتر بکے کھڑا ہے اور کہے جاتا ہے' "ہو جنٹلمین' ہو جنٹلمین' میں ایک کمپیوٹر ہوں' جاپان سے حال ہی میں درآمد کیا گیا' میں ایک کمپیوٹر ہوں' جاپان سے حال ہی میں درآمد کیا گیا۔"

جب کچھ کیڈٹ جمع ہو گئے تو ایک کیڈٹ آگے بڑھا۔ اس کے انداز ایسے تھے جیسے کمپیوٹر کے ساتھ بطور فنی ماہر انھیں بھی درآمد کیا گیا ہے۔ اس نے "کمپیوٹر" کے کان پکڑ انھیں ایک طرف مروڑا۔ کمپیوٹر خاموش ہو گیا ———— کمپیوٹر کی کلائی پکڑی گئی۔ آواز آئی ؎

چھڈ میری وینی نہ مروڑ
کچ دیاں ونگاں نہ تروڑ
بدو بدی کری دا نئیں پیار

(چھوڑ میری کلائی مت مروڑ' میری کانچ کی چوڑیاں نہ توڑ' زبردستی پیار تھوڑا ہی کیا کرتے ہیں)۔

کلائی چھوڑ دی گئی' کمپیوٹر خاموش ہو گیا۔ "آپریٹر" کا ہاتھ "کمپیوٹر" کے سینے کی طرف بڑھا' لیکن کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ صدا آئی ؎

میری زندگی کے مالک! میرے دل پہ ہاتھ رکھ دے
ترے آنے کی خوشی میں میرا دم نکل نہ جائے

دل پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔ احتجاج ہوا' "ہائے اللہ! کیوں چھیڑتے ہو' ہمیں لاج لگے ہے۔"

ہم ابھی اس شاعرانہ ایجاد کے تماشے میں مصروف تھے کہ ایک عارضی جونیئر نے بڑی عاجزی سے ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ ہم کہ اس وقت "سینیئری" کے جلال میں تھے اس کی اس حرکت پر چراغ پا ہو گئے اور گرج کر پوچھا' "کہو کیا کہتے ہو؟"

اُس نے اِسی شش و پنج حالت میں کھڑے کھڑے کہا، "سر! میں آپ سے ٹوکیوں ملا تھا!" ایک لمحے کو ہم سٹپٹائے کہ ماجرا کیا ہے لیکن کچھ فاصلے پر کھڑے چند حاضر سینیئروں کو کھی کھی کرتے دیکھ کر بات کچھ کچھ سمجھ میں آگئی۔ پوچھا:

"اچھا پھر ——؟"

بولا: "سر! آپ نے مجھ سے .. اپنی قرض لیے تھے، وہ واپس کر دیں۔"

ہم دہاڑے، "اون دی ہینڈز ڈاؤن"

حاضر جونیئر کیڈٹ ڈنٹر پوزیشن اختیار کر گیا۔ ہم نے حکم دیا کہ سو ڈنٹر نکالو۔ کچھ دیر بعد پسینے سے شرابور "قرضدار" کھڑا ہوا تو پوچھا کہ کیا اسے اس کا قرض واپس مل گیا؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ حکم دیا کہ جاؤ انہی سر کو رپورٹ کرو جنھوں نے بھیجا تھا اور بتاؤ کہ قرض واپس لے آیا ہوں۔

ہانپتا کانپتا "جونیئر" کیڈٹ واپس پہنچا اور رپورٹ دی کہ قرض واپس لے آیا ہوں۔ اُنھوں نے کہا نکالو سو۔ خاموشی اختیار کرنے پر انھیں بھی جلال آگیا۔ حکم صادر ہوا "اون دی ہینڈز ڈاؤن۔ سو ڈنٹر مکمل کرو۔" اور کیڈٹ نے پھر ڈنٹر نکالنے شروع کر دیے۔

دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔ وہ دن بھی آئے جب ہمارے سینیئر شانوں پہ پھول سجائے اکیڈمی سے پرواز کر گئے۔ ہمارا شمار سینیئر کیڈٹوں میں ہونے لگا۔ نئے کیڈٹ سہمے سہمے سے نظر آتے۔ ہم جب اور جہاں جسے چاہتے روک لیتے جو چاہتے کہتے سُنتے اور اپنی راہ لیتے۔ لیکن بالآخر جونیئر کیڈٹ بھی "یرموک" پر روانہ ہو گئے اور ان کی واپسی پر ہمیں خود کو جونیئر ڈیکلیئر کرنا پڑا۔ جونیئر کیڈٹوں نے اس روایت کو برقرار رکھا جو پہلے سے چلتی چلی آئی ہے اور اُنھوں نے ہم سے ہر وہ سلوک کیا جو ہم نے اپنے سینیئروں سے کیا تھا۔

رات کو کھانا کھا کر میس سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں خبر مل گئی کہ جونیئر کیڈٹوں نے اک کہرام مچا رکھا ہے۔ چاہا کہ راستہ بدل لیں لیکن پھر سوچا کہ کہیں تو

کہیں تو پکڑے جائیں گے۔ سیدھے سیدھے چلے چلیں —— کمپنی میں پہنچے تو جونیئر کیڈٹوں کا ایک غول کا غول نظر آیا۔ دیکھتے ہی لپکے۔ چاروں جانب سے گھیر لیا۔ سوالات کی ایک بوچھاڑ تھی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی انٹرویو لیا جا رہا تھا۔

"نام کیا ہے؟"

"قمر سعید!"

"آہا! میرے چاند سے کیڈٹ! قمر کیوں چاچا امام دین کیوں نہیں؟ اچھا آج سے ہم تمہارا نام رکھتے ہیں۔ تمہارا نام ہے، گدھا نمبر ون مارک تھری۔"

"کہاں پیدا ہوئے؟"

"لاہور میں ——!"

"کیا ضروری تھا وہاں پیدا ہونا؟ چیچوکی ملیاں میں کیوں پیدا نہیں ہوئے؟"

"تمہیں بھائی پھیرو کا اڈہ کیسا لگتا ہے؟"

"جی! اچھا لگتا ہے۔"

"بکواس کرتے ہو؟ لاہور کے ہوتے ہوئے تمہیں بھائی پھیرو کا اڈہ اچھا لگتا ہے؟ لاہور کی توہین کر رہے ہو۔ اون دی ہینڈز ڈاؤن۔"

کھڑے ہوئے تو پوچھا کہاں جاتے ہو؟ کہا جی کمرے میں۔ اجازت ملی کہ جاؤ۔ ہم لپکے سیڑھیوں کی جانب۔ ٹھٹھر سے گئے۔ پتہ چلا آج کوئی "جونیئر" کیڈٹ کوریڈور کے درمیان بچھی میٹ (Mat) کے اُوپر سے گزر کر آگے نہیں جا سکتا۔

"پھر ——؟" ہم نے سوالیہ نظروں سے اپنے "سینیئروں" کو دیکھا۔

"دیکھتے کیا ہو، میٹ اٹھاؤ اور اس کے نیچے سے گزرو۔" ہم نے تعمیل ارشاد کی، تب برآمدہ سے گزر کر اُوپر پہنچنا نصیب ہوا۔

یہاں ایک "سینیئر" سے پالا پڑا جس پر ہم ہمیشہ مہربان رہے تھے۔ نحیف و ناتوان سا یہ کیڈٹ سختیوں کی تاب نہ لا کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتا تھا چنانچہ ہم نے ہمیشہ اُس

پر ہاتھوں چھاؤں رکھی اور اسے غیر ضروری مشقتوں سے بچائے رکھا۔ اُمید ہوئی کہ آج آڑے وقت میں کام آئے گا لیکن موصوف نے نہایت "متفقہ و مسجع" انگریزی میں مخاطب کرتے ہوئے ہمیں پاس بلایا اور "آرڈر آف دی ڈے" سنایا، "آج کے دن جونیئروں کے لیے دو ٹانگوں پر چلنا منع ہے۔" تھوڑی دیر بعد ہم اس شان سے اپنے کمرے میں داخل ہوئے کہ ٹھنڈے فرش پر چل چل کر ہمارے ہاتھ شل ہو چکے تھے اور گھٹنوں پر سے پتلون کا ستیاناس۔

آخری رات

سینیئروں کے جونیئر کیڈٹوں میں بدلنے کا ایک اور مرحلہ پاسنگ آؤٹ پریڈ سے ایک رات پہلے آتا ہے۔ مقررہ وقت پر آنے والی صبح کو پاس آؤٹ ہونے والے تمام کیڈٹ جونیئر قرار دے دیے جاتے ہیں۔ تب اکیڈمی ساری رات چیختی چلاتی رہتی ہے اور سینیئر کیڈٹ افسر بننے سے پہلے آخری بار پی ایم اے کے مزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ رات بطور کیڈٹ ان کی آخری رات ہوتی ہے۔ جونیئر کیڈٹ اس موقع کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اور دوسرے دن افسر بن جانے والے کیڈٹوں کے دل و دماغ میں پی ایم اے کی تصویر کے جو نقش دھندلا گئے ہوں، انھیں اُجاگر کرنے اور مزید گہرا کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ دوسرے دن اپنے عزیزوں، رشتہ داروں وغیرہ کے سامنے کلف لگی وردی میں ملبوس، خوبصورت اور چاق چوبند کیڈٹ کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ گزشتہ رات اس بیچارے پر کیا قیامت گزر چکی ہے

پاسنگ آؤٹ پریڈ سے ایک رات پہلے کے ہنگاموں میں کچھ سینیئر کیڈٹ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ دوسروں کو ستایا جاتا ہے تو وہ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھیوں سے چہلیں کی جاتی ہیں تو ان کے سینوں سے آہیں ابھرتی ہیں۔ جونیئر انھیں دیکھتے ہیں تو ستانے کی بجائے نگاہیں چرا کر قریب سے گزر جاتے ہیں۔ یہ وہ کیڈٹ ہوتے ہیں جنھیں آخری روز بتایا جاتا ہے کہ وہ دوسرے روز پاس آؤٹ

نہیں ہو رہے بلکہ کچھ خامیوں کی وجہ سے انھیں فیل کر کے پچھلے کورس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ پی ایم اے کی ساری سختیاں ایک طرف لیکن یہ ایک لمحہ اکیڈمی کی پوری زندگی پر بھاری ہوتا ہے اور اس سے بھی بڑی بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ کسی کو یہ خبر سنائی جائے کہ اس کی خامیوں کے دور ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اسے پی ایم اے سے واپس (Withdraw) کیا جاتا ہے۔ ایسا کیڈٹ دل پر بھاری پتھر اٹھائے آنکھوں میں تیرتی نمی لیے خاموش خاموش اکیڈمی کی چیزیں واپس کرتا ہے۔ دوسرے کیڈٹوں کا اظہار ہمدردی اس کا سینہ اور شق کیے دیتا ہے اور رات کے سائے گہرے ہونے سے پہلے وہ چپکے سے اکیڈمی چھوڑ جاتا ہے۔

جشنِ شامیں! بسم اللہ!!

شہروں میں شامیں منانا روزمرہ کا معمول ہے۔ حکیم سعید تو جب بھی کراچی سے نکلیں شام ہمدرد منائے بغیر واپس آ ہی نہیں سکتے۔ جوش "طلوع" بھی اس وقت ہوتے ہیں جب سورج غروب ہو چکے۔ دھواں اُڑاتے شہروں کے پُرسکون گوشوں میں شاعر، ادیب اور فنکار شامیں منانا چھوڑ دیں تو شہروں کے نام لیوا باقی نہ رہیں کہ شہروں کے نام شہریاروں سے زندہ رہتے ہیں۔ شام منانا حسین ساعتوں میں مل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہے۔ ڈوبتے سورج کی جھلملاتی کرنوں میں جانے کیا پیغام ہوتا ہے کہ بچھڑنے والے یاد آنے لگتے ہیں، جی ملنے کو بے تاب ہونے لگتے ہیں۔ یادیں حسرتیں بن کر مچلتی ہیں اور سایے گہرے ہونے کے ساتھ ساتھ درد بھی گہرا ہوتا جاتا ہے ؎

ہوئی جو شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تُو

...... لیکن پی ایم اے میں شام کا وقت ایکسٹرا ڈرل کے لیے وقف ہوتا ہے اس لیے یہاں صرف راتیں منائی جاتی ہیں۔ انھی راتوں میں سے ایک رات بٹالین گیسٹ نائٹ کہلاتی ہے۔

ہم سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس رات بٹالین کی طرف سے کچھ مہمانوں کو مدعو کیا جاتا ہوگا، ہر طرح کی ماکولات و مشروبات میز کی زینت بنتی ہوں گی اور کیڈٹ خوب دادِ عیش دیتے ہوں گے۔ لیکن اے کاش مہمانوں کو مدعو کرنے کا اختیار واقعی ان کیڈٹوں کے ہاتھوں میں ہوتا جن سے مل کر بٹالین بٹالین بنتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پی ایم اے گیٹ سے باہر راہ چلتے

دا بغیر شاید مدعو کیے جاتے۔ خود میس کے ویٹروں کو اپنے ساتھ بٹھانا کیڈٹ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے کہ مساوات کی ایک مثال ہوتی، یا کبھار نہیں تو اکیڈمی کے قریب واقع ایک پہاڑی 'ہیلو ہیپر' کے کونوں کھدروں میں بسنے آشیانوں کے مکینوں کو دعوت دی جایا کرتی کہ سنا ہے پرندوں کو کھانا کھلانے سے انسان کے گناہ جھڑتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ مہمان بس گیسٹ نائٹ میں کبھی نظر آتے جنہیں اب تک مدعو کیا جاتا رہا ہے اور آئندہ بھی کیا جاتا رہے گا۔

بھلا آپ ہی بتائیے بھنے بھنائے مرغوں کی سڈول رانیں دعوتِ عیش دے رہی ہوں، ان ڈشوں میں کہ ازل سے جن کے مقدر میں محبوب کے رویے کی طرح سرد ہونا لکھا ہو، گرم گرم پلاؤ کا ڈھیر ہو، دیگر کھانوں سے بھی بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے ہوں اور مختلف قابوں میں ہڈیوں کی جگہ سچ مچ کی بوٹیاں اور وہ بھی بڑی بڑی بھنی بھنی موجود ہوں، خوشبوؤں کے لپٹے آستینیں چڑھا کر کچھ کر گزرنے پر مجبور کر رہے ہوں، جی بے اختیار گنگنا رہا ہو ـــ

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن سوس ر م دیا ہے جواز کا

لیکن کانٹوں اور چھریوں کا استعمال واجب بلکہ فرض کر دیا گیا ہو، کچھ گھورتی آنکھیں آپ کی پہرے دار بھی ہوں اور وہ لوگ کہ جنہیں دور سے دیکھ کر کیڈٹ کی سٹی گم ہو جاتی ہے مہمانِ خصوصی بن کر آپ کے دائیں بائیں تشریف فرما ہوں تو کیا انصاف کر سکیں گے آپ خدا کی ان نعمتوں سے! پلاؤں کا اُمڈا لاکھ مسکرائیں لیکن کیونکر ممکن ہے بھول جانا ان کی جبینوں کا عالم شکن در شکن۔

بٹالین گیسٹ نائٹ کی ریہرسل بہت پہلے شروع کر دی جاتی ہے۔ ہر افسر اور ہر کیڈٹ کے لیے میز اور نشست مخصوص ہوتی ہے۔ پھر ہر افسر کے نام ایک کیڈٹ الاٹ کیا جاتا ہے جس کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وقوعے کی رات وہ افسر کے ساتھ چپکا رہے۔ جب میس میں داخل ہونے کا اشارہ ملے تو ان کی میز تک لے جا کر مخصوص کرسی تک ان کی رہنمائی کرے۔ اس کے علاوہ ایک اور پارٹی بھی ترتیب دی جاتی ہے۔ جس کا کام ڈنر کے بعد مہمانوں کو ہلکے پھلکے مزاحیہ پروگرام اور موسیقی کی دھنوں سے محظوظ کرنا ہوتا ہے۔ میس میں ڈنر نائٹ کی ریہرسل ہو رہی ہے اور اُدھر پارٹی کی دھوم

میں پارٹی والوں کی دھنیں ترتیب دے رہی ہوتی ہے، کچھ لوگ منہ بگاڑنے کی ریہرسل کر رہے ہوتے ہیں اور کچھ تان سین کو اس کی قبر میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے پر مجبور کر رہے ہوتے ہیں۔ کچھ غالب کے پرزے اڑانے کی فکر میں ہوتے ہیں تو کچھ اقبال کے اچھے بھلے کلام کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ ہم کہ بلبل کی طرح غزل سرا ہو سکتے ہیں نہ کبھی آلاتِ موسیقی سے شوق فرمانے کے مرتکب ہوئے ہوں، جانے کس طرح اس پارٹی میں شامل کر لیے گئے۔ شاید میس میں ہونے والی ریہرسل سے بچنے کی خاطر ہمارے ہاتھوں کوئی ایسی حرکت سرزد ہو گئی ہو جو اس شمولیت کا باعث بنی ہو۔

ایک دن ہوا یہ کہ اس میوزک پارٹی نے باہمی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ریہرسل کافی ہو چکی۔ کل کے دن ناغہ کیا جائے ـــ اس فیصلے کو دانستہ مخفی رکھا گیا، ورنہ کھانے کی ریہرسل میں شامل ہونا پڑتا۔ یہ ناغے والا دن ہفتے کا دن تھا اور اس روز اکیڈمی میں 'آدھی' چھٹی ساری چھٹی ہو جاتی ہے' اور اس فیصلے کا مقصد یہی تھا کہ آدھے دن کی اس چھٹی کو ڈرل انسٹرکٹروں، ویٹروں اور افسروں کی زد سے دور بستروں میں دبک کر گزارا جائے لیکن اسے ہماری شامتِ اعمال کہیے کہ دوسرے دن جب سورج ڈھلا اور عام کیڈٹ بٹالین گیسٹ نائٹ کی ریہرسل کے لیے روانہ ہو گئے، ہماری آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ اچانک ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ شام سینما ہال میں گزاری جائے کہ ایک خوبصورت سی انگریزی فلم کی نمائش جاری تھی جس میں ایک کافر ادا فرنگن کے رقص کا ذکر ہم نے اتنے تواتر سے سنا تھا کہ کئی بار رال ٹپک پڑی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہماری بٹالین گیسٹ نائٹ کی ریہرسل میں مصروف تھی اور اس بٹالین کے ہر کیڈٹ پر فلم حرام تھی ـــ تھوڑی دیر سر کو کھجایا اور یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ آخر ہم میوزک پارٹی میں شامل ہیں میس سے غیر حاضری کا مطلب معمول کے مطابق ہی لیا جائے گا کہ ہم کسی جگہ بیٹھے ریہرسل کر رہے ہوں گے۔ دل نے اس بات پر صاد کیا اور پورے شرحِ صدر کے ساتھ ہم فلم دیکھنے روانہ ہو گئے

فلم دیکھی اور خوب محظوظ ہوئے۔ فلم ختم ہوئی، قومی ترانہ گایا گیا، افسر حضرات رخصت ہوئے، کیڈٹ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایڈجوٹنٹ کی کڑک دار آواز سنائی دی ـــ

سٹ ڈاؤن!

سب کیڈٹ جامد ہو کر رہ گئے۔

"فرسٹ بٹالین کا کوئی کیڈٹ یہاں موجود ہے؟"

اور ہم سُن ہو کر رہ گئے۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد سوال پھر دُہرایا گیا۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ایڈجوٹنٹ کے مخاطب صرف ہم ہی ہیں اگر اس بار جواب نہ دیا تو کان سے پکڑ کر کھڑے کر دیے جائیں گے۔ "یس سر" کا نعرہ لگا کر ہم مودب کھڑے ہو گئے۔

"کوئی اور ——— ؟" اِستفسار ہوا۔

اور اس بار ہمارا حوصلہ بندھا کہ ہمیں بارش کا پہلا قطرہ ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک ——— دو ——— تین ——— چار ——— اچھے بھلے آٹھ دس کیڈٹ ایسے نکل آئے جنہیں ہونا تو اس وقت بٹالین میس میں چاہیے تھا لیکن مصروف رہے وہ قلب و نظر کو آسودہ کرنے میں ——— حکم ہوا کہ سب کیڈٹ سٹیج پر چڑھ جائیں۔ ایک فلم ختم ہوئی تھی، دُوسری چلنے والی تھی ایک غیر بٹالین کے سامنے برسرِعام ایک کیڈٹ کو کھڑا کر کے یہ کہنا کہ اس کی شکل دیکھو، اس کے لیے مر جانے کا مقام ہے لیکن موت کا ایک دن معین ہے اس لیے اس دن وہ نہ آئی۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی کہ میس جانے کی بجائے ہم وہاں کہاں آ نکلے ہیں۔ اب ہم کسی درخت پر بیٹھے آم تو توڑ نہیں رہے تھے کہ کہہ سکتے ہوا کے کچھ شرارتی جھونکے ہمیں اس درخت پر اُڑا لائے ہیں وہ پوچھتے کہ آم تمھاری جیبوں میں کیسے پہنچ گئے تو کہہ سکتے "سر! اسی بات پر تو ہم اتنی دیر سے حیران و پریشان ہو رہے ہیں" لیکن ہم کسی باغبان کے مخاطب نہ تھے، ایڈجوٹنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ عذرِ لنگ پیش کیا کہ ہم میوزک پارٹی کے کارندوں میں سے ہیں۔ میس کی ریہرسل سے مستثنیٰ قرار دیے گئے ہیں۔

"لیکن تمہیں اس وقت اپنی پارٹی کے ساتھ مصروف ہونا چاہیے تھا؟"

اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ پوری پارٹی کا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیتے۔ خاموشی اختیار کی اور سزا کے مستحق قرار دیے گئے۔ سزا کیا تھی؟

آئندہ اِتوار تک چلنا (Walking) بند جب کبھی ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانا ہو تو

دوڑ کر جایا جائے۔

پورے ایک ہفتے تک ہمارا یہ حال رہا کہ میس پہنچتے پہنچتے تو سانس پھولی ہوتی۔ واپس آتے تک ناشتہ ہضم ہو چکا ہوتا اور کینٹین جاتے تو نبضیں ڈوب رہی ہوتیں ——— البتہ ہفتے کے آخر میں ہم سوچ رہے تھے کہ کیوں نہ آئندہ "میراتھن ریس" میں حصہ لیا جائے کہ اس ریس میں تو محض چھبیس میل دوڑنا پڑتا ہے اور ہم ایسے کئی چھبیس میلوں کی ریہرسل کر چکے تھے لیکن پھر یہ سوچ کر ارادے ملتوی کر دیے کہ ہمیں تو پہلی بار اس طرح کی صورت کا سامنا ہوا میراتھن ریس کے شرکاء جانے کتنی بار ایسی سزاؤں کے مستحق گردانے جا چکے ہوں گے۔

ہمارے دوڑتے دوڑتے بٹالین گیسٹ نائٹ آن پہنچی۔

سرِشام میس جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں ——— دھوبی نے میس کٹ کو غالباً اُبال چاندی میں کھنگال بھیجا تھا اور اس سرخ چوڑی پٹی کی ساری شکنیں دُور کر دی تھیں جسے کمر پر باندھا جاتا ہے۔ ہمیں آج تک اس کا کوئی مصرف اس کے سوا سمجھ میں نہ آیا کہ ڈنر کے وقت سینئر افسر اس کی آڑ میں جو کچھ چاہیں جتنا چاہیں نگل سکتے ہیں کہ یہ بیلٹ بڑھتے پیٹ کی تمام خرابی کو چھپائے رکھتی ہے اور ڈنر کے بعد جونیئر کیڈٹ اس کی مدد سے پیٹ پر پتھر باندھ سکتے ہیں کہ خاصی چوڑی ہوتی ہے۔

"سج بن کے تے گھوٹ لگا کے" ہم چلے جانبِ میس۔ راستے میں فروٹ شاپ پڑتی تھی۔ اس کے قریب سے گزرے کچھ سوچا اور پھر

پہلے تو ہم نے غور سے دیکھا اِدھر اُدھر
پھر سر جھکا کے داخلِ میخانہ ہو گئے

دیکھا وہاں اور بہت سے جونیئر کیڈٹ موجود ہیں اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ماحضر تناول فرما رہے ہیں۔ کینٹین والا پھلوں کے چھلکے اور کیڈٹوں کی کھالیں سکا سکا کر اُتارے جاتا تھا۔ ہم نے بھی جوس کا ایک گلاس حلق میں انڈیلا اور لپکتے جھپکتے میس میں جا پہنچے۔

سورج نے ابھی ابھی منہ چھپایا تھا لیکن حیا کی لالیاں شفق کو منتقل کر گیا تھا۔ میس

موضوع نظر آتا ہے جو بین الاقوامی معاملات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس پیریڈ میں بھی کیڈٹ کی رسائی زیادہ سے زیادہ "کیمل ٹری" (Camel Tree) تک ہو پاتی ہے۔ اونٹ ایسی شکل کا یہ درخت دُور ایک پہاڑی پر واقع ہے اور میپ ریڈنگ کی اکثر مشقوں میں کیڈٹوں کے لیے وبالِ جان بنا رہتا ہے۔ (کاش یہ درخت کسی طرح محکمہ جنگلات والوں کی نظروں میں آ جائے) محض سنتری کے فرائض پڑھ کر آنے والوں کو جہاں بانی کے آداب سکھانا، راکٹ لانچر کے لیے مناسب محلِ وقوع والا دو گز زمین کا ٹکڑا تلاش نہ کر سکنے پر پلاٹون کمانڈر کی جھڑکیاں کھانے والے کیڈٹ کو بڑی طاقتوں کی کشمکش کے پس منظر میں فوجی لحاظ سے اہم علاقوں کا حدود اربعہ سمجھانا اور ایبٹ آباد و ملحقہ علاقوں کے نقشے کو سمجھنے میں جان کھپا دینے والے کیڈٹوں کو دنیا کے نقشے سمجھنے میں مدد دینا اور ٹیلوں سے بلند ہو کر کوہ راکیز اور اپلیشین تک کے لیے طاقتِ پرواز دینا کچھ انھی کا کام ہے لیکن اس وقت ظاہر ہے وہ کلاس لینے نہیں ڈنر کھانے آئے ہوئے تھے چنانچہ دنیا کے نقشوں کو کلاس روم اور سارے جہاں کے درد کو اپنے گھر ہی چھوڑ آئے تھے۔ شگفتگی کا رنگ نمایاں تھا۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ بین الاقوامی الجھنوں میں الجھا کوئی شخص اتنا سلجھا ہوا بھی ہو سکتا ہے۔

ہم ان سے باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک بینڈ کی سُریں مدھم ہوتی چلی گئیں اور ایک بگل کی سنسناتی سی چیخ سنائی دی۔ جانے یہ آواز ان انتڑیوں کی نمائندگی کرتی تھی جو سورۂ اخلاص کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ یا پی ایم اے کے اس بینڈ کی طرح جو ڈرل کرانے والی موسیقی کے علاوہ کسی اور دھن سے آشنا نہیں، یہ آواز بھی کسی اجڈ قسم کے بگل سے نکلی تھی۔ بہرحال اس کی پکار میس میں داخلے کا اعلان تھی۔ ہم میجر قاضی کو اور دوسرے کیڈٹ اپنے اپنے افسروں کو اپنی معیت میں لیے میس میں داخل ہوئے۔ جانے یہ کئی راتوں کی مسلسل ریہرسل کا نتیجہ تھا یا خالی پیٹ لان میں کھڑے کھڑے ہمتیں جواب دے گئی تھیں کہ مزید کھڑے رہنے کی تاب باقی نہ رہی تھی کہ دروازوں سے میزوں تک کا فاصلہ پلک جھپکتے طے ہو گیا۔ حالانکہ میس کا رقبہ فٹوں میں نہیں گزوں تک محیط ہے۔ اس کا طول سو گز سے تو کیا کم رہا ہو گا ——— بہرحال لوگ اپنی اپنی میزوں پر پہنچ چکے تھے لیکن نشستیں سنبھالنے کی

کے رنگین قمقمے ابھی روشن نہ ہوئے تھے۔ تاہم فوجی بینڈ مدھم مدھم سروں میں کچھ نغمے الاپ رہا تھا اور کیڈٹ بُراق ایسی کلفوں میں ملبوس لقے کبوتروں کی طرح غٹرغوں غٹرغوں کرتے، کبھی ادھر کبھی ادھر محوِ خرام تھے۔

ہم بھی ان میں جا شامل ہوئے اور میجر قاضی ریاض کی تلاش شروع ہوئی کہ ہماری یہ ذمہ داری قرار پائی تھی کہ ان کی پہلی جھلک پا لینے کے بعد ان سے منسلک ہو جائیں ان سے باتیں کرتے رہیں (بلکہ ان کی سنتے رہیں) میس میں داخلے پر ان کی نشست تک ان کی رہنمائی کریں اور آخر وقت تک ان کی جان نہ چھوڑیں۔ بزبانِ انگریزی اس سارے عمل کو "ایسکارٹنگ" (Escorting) کہتے ہیں۔ ہر افسر کے ساتھ ایک عدد کیڈٹ بطور ایسکارٹ مقرر کر دیا گیا تھا۔

میجر قاضی ریاض کے نام کے ساتھ قاضی کا آنا محض ایک اتفاقیہ امر ہے۔ شاید پیشے سے ان کا کوئی تعلق ہے نہ نکاحوں کے جھنجھٹ میں پڑتے ہیں۔

پی ایم اے میں قومی و بین الاقوامی امور پڑھانے پر مامور ہیں۔ کیڈٹوں کو ان تک پہنچنے سے پہلے ڈرل سکوائر یا پی ٹی گراؤنڈ سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ ڈرل سکوائر میں بیلنگ کر کر کے ان کا سر پکا ہو جاتا ہے۔ پی ٹی گراؤنڈ کی اچھل کود سے ان کے حواسِ خمسہ آپس میں کچھ یوں گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ بعد میں ان کے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس وقت وہ کلاس روم میں بیٹھے ہیں، یا بیڈ روم میں لیٹے ہیں۔ نتیجتاً میجر قاضی کو بھری کلاس میں سوتے کیڈٹوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنا پڑتا ہے۔ پی ٹی یا ڈرل کے علاوہ دوسرے پیریڈ بھی ان کی کوئی مدد نہیں کرتے کہ سگنل کے پیریڈ میں کیڈٹ وائرلیس سیٹ اٹھائے ہلو وَن، ہلو وَن، ہو ڈو یو ہیئر می اوور (Hullo one Hullo one How do you hear me over) کی گردان کرتے محض مختلف نمبروں کی خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ تدبیرات و تزویرات (Tactics) کے پیریڈ میں زیادہ سے زیادہ "رات اور دن کے وقت سنتری کے فرائض" سے آگاہ ہوتے ہیں یا "حالتِ جنگ اور امن میں سیکشن کمانڈر کی ذمہ داریوں" سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ لے دے کے میپ ریڈنگ (Map-reading) ایک ایسا

Sorry!

This Page is Missing.

شہر لیے گئے۔ الزام کسی پر آیا ہو جو ہیر کیوسٹ ماسٹ پر ہمیشہ سے ان غریبوں کے سر آتا رہا ہے۔ کھا کھا کے سوجے ہوئے چہروں اور کانوں سے آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔

——— کھڑے ہوتے ہوئے کرسی کو احتیاط سے نہیں ہٹایا گیا تھا۔ پورے ہال میں ایک "زلزلہ" آ گیا تھا۔ مہمان خصوصی کے کلمات ختم کرنے کے بعد بھی تمھارے جتنے مل رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ جھٹکوں کچھ قلابازیوں اور دھمیں کے کچھ چکر لگانے کے بعد جان بچوئی اور لوٹ کے کیڈٹ گھر کو آئے۔

آدابِ فلم بینی

بات اس دور کی ہے جب مزاج یار کی برہمی خاصی حد تک رفع ہو چکی تھی سینیئر حضرات کو سکون آ چکا تھا اور زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ ہم نے جواب تک اپنے کمرے کو آخری پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے آتے تھے فیصلہ کیا کہ ان جہانوں کا سراغ لگایا جائے جو بیرکوں سے آگے ہیں۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ رہائشی عمارات سے گزر کر سب سے آخر میں جو بڑا سا ہال ہے وہاں ہفتے میں دو دن فلم بھی دکھائی جاتی ہے اور یہ کہ کیڈٹوں کو وہاں جانے کی عام اجازت ہے الا یہ کہ پلاٹون کمانڈر یہ اجازت خاص طور پر منسوخ کر دے۔ ہم پر ابھی تک یہ خطہ تسخیر نہ ہوا تھا چنانچہ فیصلہ کیا کہ اس رعایت اور تفریح سے جو وہاں میسر ہے ضرور فائدہ اٹھایا جائے لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ ہمیں اکیلے ہی چھاچھ پینے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہمسائے سے بات کی کہ کیوں نہ اس ہفتے کی شام لکھ دی جائے فلم کے نام ——— اس نے کانوں پر ہاتھ دھرا اور بولا، "بابا اس بات پر شکر کرو کہ سینیئر ہمیں بھول رہے ہیں، پڑھائی میں دل لگاؤ۔ کیوں تمھیں پر نکل رہے ہیں۔"

لیکن صاحبو! یہ پر بھی تو ہوتے ہیں نا جو پورے چاند کی رات چکوری کو چندا کی طرف پرواز کا عزم عطا کرتے ہیں۔ ہم نے کنونسنگ جاری رکھی اور بالآخر اپنے ساتھی کو فلم دیکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اب فلم دیکھنے میں ہم پر جو بیتی، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جب تک آپ پی ایم اے کے آدابِ فلم بینی سے واقف نہ ہوں۔ اس لیے پہلے ذرا انہی آداب کا حال سنیے۔

سینما ہال میں نشستوں کا تعین اس طرح سے ہوتا ہے کہ سب سے آگے اگلی قطار

جونیئر کیڈٹوں کے لیے ہوتی ہیں۔ اس کے بعد سینئر کیڈٹوں کے لیے اور ان سے پیچھے کی قطاریں ان سے بھی سینئر کیڈٹوں کے لیے آخری نشستیں افسروں کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کے داخلے کا دروازہ بھی ہال کی پچھلی جانب ہوتا ہے لیکن کیڈٹ سٹیج کے قریب کے ایک دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ دروازے پر آکر کیڈٹ اٹن شن ہو جاتا ہے اور نظروں سے ہال کا جائزہ لے کر اپنے مرتبے کی قطاروں میں ایک نشست چنتا ہے۔ پھر باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے اپنی نشست کی جانب بڑھتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کیڈٹ سے آگے جانے والے کیڈٹ نے بھی اسی نشست کا انتخاب کیا ہو۔ اب آگے والا کیڈٹ کرسی پر بیٹھ جائے تو حکم یہ ہے کہ پیچھے والا کیڈٹ اباؤٹ ٹرن ہو کر مارچ کرتا ہوا ہال سے باہر نکل جائے اور دوبارہ اس عمل کو دہرائے نشست سنبھالنے کی صورت یہ ہے کہ کیڈٹ تن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر ہوتے ہیں، نظریں سکرین کی جانب۔ دائیں بائیں دیکھنا منع ہے۔ رومال نکالنا، پسینہ پونچھنا خلافِ ادب اور بات چیت کرنا جرمِ عظیم۔ جب تمام کیڈٹ نشستیں سنبھال لیں تو مقررہ وقت پر ڈیوٹی سارجنٹ ہال میں داخل ہوتا ہے۔ دروازے کے پردے کھینچ دیتا ہے اور مارچ کرتا ہوا اپنی مخصوص کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب چاہے آدھے ہال کی کرسیاں خالی پڑی ہوں، باہر سے کوئی کیڈٹ اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ کھنچا ہوا پردہ ایک علامت بھی ہے اور حکم بھی۔ علامت اس بات کی کہ کیڈٹ دیر سے پہنچا اور حکم یہ کہ آنے والا اُلٹے قدموں لوٹ جائے۔ کیڈٹ پردے کی زبان سمجھتے ہیں۔

اُدھر اندر ہال میں اک سکوت چھایا ہوتا ہے۔ پھر اچانک تاریکی بھی چھا جاتی ہے اور فلم شروع ہو جاتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے ایک کھڑکھڑاہٹ سی ہوتی ہے۔ تمام کیڈٹ کرسیوں پر نیم دراز ہو جاتے ہیں اور وقفے تک سرمائی خوابی (Hibernation) کی یہ کیفیت قائم رکھتے ہیں۔ وقفہ ہوتے ہی تمام کیڈٹ پھر چست ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے پچھلی قطاروں سے سینئر باہر نکلتے ہیں پھر جونیئر اور پھر ان کے جونیئر۔ باہر گرم گرم چائے کا انتظام ہوتا ہے۔ وقفے کے بعد تمام کیڈٹوں کو انہی نشستوں پر بیٹھنا ہوتا ہے جن پر

وہ پہلے براجمان تھے ـــــ فلم ختم ہونے پر تمام کیڈٹ ایک دم کھڑے ہو کر بازوؤں کی سمتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ درمیانی راستے سے دائیں والے کیڈٹ دائیں جانب اور بائیں والے بائیں جانب۔ تب سکرین پر سبز ہلالی پرچم لہراتا ہے اور تمام کیڈٹ بلند آواز سے قومی ترانہ پڑھتے ہیں۔ ترانہ ختم ہونے پر پہلے افسر باہر جاتے ہیں۔ آخری افسر باہر جانے سے پہلے باآوازِ بلند کہتا ہے۔ "جنٹلمین کیری آن" (Gentlemen! Carry on) تب پہلے ڈیوٹی سارجنٹ دروازے کی طرف بڑھتا ہے، پردہ سرکاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔ پھر سینیارٹی کی ترتیب سے کیڈٹ۔ باہر نکل کر تمام کیڈٹ دو دو کی ٹولیوں میں قدم ملا کر مارچ کرتے ہوئے اپنی اپنی کمپنی کو سدھار جاتے ہیں۔ مقصد اس ساری ڈرل کا یہ کہ کیڈٹ کے لاشعور میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ تفریح کے لمحات بھی کسی ضابطے کے پابند ہونے چاہئیں۔ بے خودی اور سرشاری کے عالم میں بھی ایک فوجی کو عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔

اب سنیے ہماری داستان۔ ہم اکیڈمی ذرا تاخیر سے پہنچے تھے اس لیے مختلف جگہوں کے آداب کے ابتدائی اسباق سے محروم رہ گئے تھے۔ میس میں ہم پر جو گزری اس کا حال سنا چکے ہیں۔ یہی حال دوسری جگہوں کا تھا۔ جہاں جہاں روزمرہ کی ضروریات کے لیے جانا پڑتا تھا وہاں کے قواعد سے تو واقفیت ہو چکی تھی لیکن فلم کے بارے میں کسی نے ہمیں بتایا نہ ہم نے کسی سے پوچھا۔ ہماری جانے بلا کہ فلم دیکھتے ہوئے بھی یہاں پریڈ ہو گی۔ سینما ہال نہ ہوا ڈرل سکوائر ہو گیا۔

اپنے ہمسایے جی سی منور کے ساتھ قدم ملاتے ہم سینما ہال پہنچے۔ باہر کیڈٹ مختلف ٹولیوں میں بٹے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ڈیوٹی سارجنٹ کی آواز ابھری "موو ان" (Move in) تو کیڈٹوں نے ایک ایک کر کے اندر جانا شروع کیا۔ ہم بھی ہال میں داخل ہو گئے لیکن کس شان سے کہ ہمارے ہاتھوں کے انگوٹھے کوٹ کی جیبوں کے اندر تھے اور انگلیاں ستار بجا رہی تھیں۔ خراماں خراماں چلتے ہم آگے بڑھے تو دیکھا گھبرائے گھبرائے کیڈٹ سینما ہال میں بھی باقاعدہ مارچ فرما رہے ہیں۔ ہمیں ان پر حیرت ہوئی۔ ایک نشست

کو شایانِ شان پاکر اس پر بیٹھ گئے۔ پھر کچھ سوچ کر اسے چھوڑا اور ساتھ والی نشست پر جا بیٹھے۔ نگاہیں اٹھائیں تو منتو غائب۔ ہم اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے۔ دیکھا منتو درمیانی راستے سے پہلی جانب کی ایک نشست پر بیٹھ رہا ہے۔ ہم نے ہانک لگائی، "منتو اِدھر آجاؤ۔ میں نے تمہارے لیے یہ سیٹ رکھی ہے۔"

"شکریہ، شکریہ۔ تم بیٹھو۔ "شرافت" مجھے بڑے دنوں بعد ملا ہے میں اس سے بات کروں۔"

ہم دائیں پیر کو بائیں گھٹنے پر رکھ کر بیٹھ گئے اور پورے ہال میں ابھرتی موسیقی کو کان دینے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے دائیں بائیں کی نشستیں بھی بھرنا شروع ہوگئیں — اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ دائیں والا کیڈٹ ہم سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کا دباؤ ہمارے ہاتھ پر سخت ہو رہا تھا اور وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ہم نے کان اس کے قریب کیے تو اس کی سرگوشی میں گھبراہٹ شامل ہوگئی، "خدا کے لیے پرے ہٹو — سیدھے ہو کر بیٹھو۔" ہمیں اس پر سخت غصہ آیا۔ پوچھا، "تم فلم دیکھنے آئے ہو یا قوّالی کرنے۔ آرام سے بیٹھو۔" اس نے ہاتھوں کی انگلیوں سے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سن ہوگیا۔ "کیا واہیات کیڈٹ ہے؟" ہم نے دل میں سوچا اور ہال کی خوبصورتی کا جائزہ لینے لگے۔ سُرخ گہرے رنگ کے ریشمی پردے، جھالریں، سلوٹیں، منقش چھت، آویزاں فانوس، دیواروں پر لگے مختلف فریم اور فریموں میں سجے ہوئے خوبصورت مناظر...... اور...... یہ سارے کیڈٹ...... یہ سارے کیڈٹ ہمیں ہی کیوں گھور رہے ہیں — دیواروں کا جائزہ لیتے لیتے ہم ذرا ترچھے ہوگئے تھے اور گردن کچھ گھوم گئی تھی۔ دیواروں سے نظر پھسلی تو دیکھا...... کہ پیچھے بیٹھے سارے سینئر کھا جانے والی نظروں سے ہمیں گھور رہے ہیں۔ ہماری گردن جلدی سے واپس آگئی۔ سوچا یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ سارے کیڈٹ ہمیں کیوں گھور رہے ہیں۔ دل کو تسلی دی کہ خواہ مخواہ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ بھلا تمہیں کیوں گھورنے لگے یہ کیڈٹ۔
پہلو بدل کر ہم نے دوسری جانب کی دیوار کو گھورنا شروع کیا اور کنکھیوں سے کیڈٹوں

کو دیکھا تو ساری غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔ ہم نگاہوں کا مرکز تھے۔ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بائیں والے کیڈٹ سے ہولے سے پوچھا:

"ہم سے کوئی غلطی ہوئی؟"

اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور بولا "چپ"۔ اب ہم نے غور شروع کیا تو خوف کی ایک لہر سی جسم میں سرایت کر گئی۔ یہ جو سب کیڈٹ بندوق بنے بیٹھے ہیں۔ آخر اس میں کوئی مصلحت ہے۔ اور یہ جو بلا استثناء ہر کیڈٹ مارچ کرتا ہوا اندر آ رہا تھا تو انہیں کتے نے تو نہیں کاٹ کھایا۔ کوئی حکم ہی ہوگا۔ اچھی بھلی سردیوں میں ہمیں پسینہ آگیا۔ رومال نکال کر پیشانی پر پھیرنا چاہا تو دائیں کیڈٹ کی سرگوشی سنائی دی:

"بند کرو رومال۔ بند کرو اسے۔ او خدا کے لیے۔ کہاں سے آئے ہو تم؟"

ہم نے رومال تہہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا، "رومال استعمال کرنا بھی جرم ہے؟"

"چپ" ان کی ہشت سنائی دی۔ اتنے میں ڈیوٹی سارجنٹ نے پردہ کھینچا اور باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے ہال کے پیچھے کہیں گم ہوگیا۔

اچانک ہال میں تاریکی چھا گئی اور یکدم فلم شروع ہوگئی۔ کسی بلیڈ کو مشتہر کرتی کسی حسینہ کی مسکراہٹیں نہ تاریکی کو چیرتے جلتے بجھتے بلبوں کا کوئی اشتہار۔ بلدیہ کی طرف سے شہر کو صاف رکھنے کی اپیل نا سگریٹ نوشی سے پرہیز فرمانے کی تلقین۔ آئندہ پروگرام کے چٹ پٹے ٹریلر نہ کسی کے حسن کے راز والی چھوٹی چھوٹی اشتہاری فلمیں۔ بس سیدھی سادی اصل فلم کا آغاز ہوگیا۔

ہم اسی سوچ میں تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ پیچھے سے تنبیہ نما ایک سرگوشی سنائی دی۔ "تم نیچے نہیں سرک سکتے تو یہ گردن توڑ کر گود میں رکھ لو۔" ہم چپکے سے سرک گئے اور سب کچھ بھلا کر فلم دیکھنے لگے۔ یہ کوئی پنجابی فلم تھی۔ مار دھاڑ سے بھرپور اور ہیروئنوں کے ناچ گانوں سے لبریز۔ مزاحیہ کردار بھی تھے۔ کسی لطیفے پر ہمیں ہنسی آگئی۔ کھل کر ہنسنا چاہا لیکن ابھی قہقہہ چھت تک بھی نہ پہنچا ہوگا کہ ہم نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ پورے ہال میں قہقہے کی آواز صرف ہماری تھی۔ انسان بھی کیا عجوبہ ہے۔ اکیلے اکیلے اس سے غم جھیلے جاتے ہیں نا خوشیاں

برداشت ہوتی ہیں۔ اَلم کے بادل چھا جائیں تو "کوئی غمگسار ہوتا" کی سی خواہش کرتا ہے۔ بہاریں مسکرائیں تو رازداں ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ دل کی لگی کہے بنا رہا نہ جائے۔ غمگسار اور رازداں ایک ہی کردار کے دو روپ ہیں۔ وہ ایک کردار جو ہمارے احساسات کا شریک ہوتا ہے۔ یہاں بھری محفل میں کوئی ہمارا شریک نہ تھا۔ ہم چپکے ہو رہے۔

وقفہ ہونے تک ہم خاصے سنبھل چکے تھے لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ باہر آئے تو تمام سینئر بیک وقت ہم دو کیڈٹوں سے مخاطب تھے۔

"تم سانپ کی طرح گردن کیوں ہلا رہے تھے؟"

"نواب کی طرح بیٹھا تھا شہزادہ۔"

"اسے سردیوں میں بھی پسینے آتے ہیں۔"

"نہیں نہیں، یہ اپنی گرل فرینڈ کا دیا ہوا رومال دکھانا چاہتا تھا۔"

"اس کی چال دیکھی تم نے۔ راجہ اندر کے دربار سے سیدھا یہیں آ گیا ہے یہ اٹھ کر۔"

"میں پوچھتا ہوں تم پیدا کہاں ہوتے تھے؟"

"بڑی سُریلی آواز ہے تمہاری۔ تم رہ نہیں سکتے تھے مسعود کو آواز دیے بغیر؟"

ادھر مسعود بیچارہ ہمارا کہا ماننے کی سزا بھگت رہا تھا۔ اور وہ شرافت بھی بھیگا بلا بنا کھڑا تھا جو کافی دنوں بعد مسعود کو ملا تھا اور جس سے وہ کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

سینئروں کے تابڑ توڑ سوالات کی بوچھاڑ میں ہم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"سر دیکھیں، ہمیں معلوم نہیں تھا۔ غلطی ہو گئی۔ آپ ناراض ہیں تو ہم چلے جاتے ہیں واپس۔"

"تمہیں کہا کس نے تھا کہ فلم دیکھنے آؤ۔" ہماری تمام تر التجاؤں کے باوجود ہمیں واپسی کی اجازت تو نہ ملی البتہ یہ حکم ضرور ملا کہ فلم ختم ہونے پر اپنے کارپورل کو رپورٹ کریں اور اسے اپنی حماقتوں کی کہانی سنا کر اس سے سزا کی فریاد کریں۔

وقفے کے بعد ہم کرسی پر نہیں کانٹوں کی سیج پر بیٹھے رہے۔ فلم ختم ہوئی تو ہم دونوں

اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھے اپنے کارپورل کے پاس پہنچے۔ ہم سے پہلے ہی انہیں رپورٹ مل چکی تھی۔ جاتے ہی انہوں نے پوچھا:

"کر آئے ہو کمپنی کا نام روشن؟"

سزا یہ تجویز ہوئی کہ آئندہ تین راتوں تک ہم ایف ایس ایم او پہن کر رات کے ڈھائی بجے ان کے کمرے کے باہر حاضری دیا کریں گے۔ یہ وقت کیڈٹ کیا ہر شخص کے لیے مدہوشیوں کا وقت ہوتا ہے۔ رات کے اس پہر آنکھ کھل جائے تو صبح پھر کروٹیں بدلتے ہی آتی ہے۔ ہم تین دنوں تک سوتے میں جاگتے اور جاگتے میں سوتے رہے۔ ڈھائی بجے اپنے کارپورل کے کمرے کے باہر کھڑے ایک دوسرے کا لباس چیک کیا کرتے پھر دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں اٹھایا کرتے۔ ان کے لیے بھی تو یہ سزا ہی تھی ہمارا کارپورل ہونے کی۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا ہمارا آداب فلم بینی سے ناآشنائی کا۔

معمولاتِ کیڈٹ

پی ایم اے میں ایک تو ہوتا ہے روزمرہ کا معمول، لگے بندھے پیریڈ، صبح سویرے سے دوپہر تک مختلف کلاسیں، پیریڈ شروع ہونے سے پہلے سٹاف کے ہاتھوں تھوڑی سی ڈرل اور ختم ہونے پر پیچر تھوڑا بہت جھونگا! یہ سب معمول کی باتیں ہیں لیکن اکثر کیڈٹوں کے لیے یہ معمول بڑے تسلسل کے ساتھ ٹوٹتا رہتا ہے یعنی ہفتے اور بدھ کے روز جبکہ آدھی ہفتے ساری "چھٹی" ہو جاتی ہے۔ انھیں ایکسٹرا رول کال، ایکسٹرا پریڈ یا ایکسٹرا ڈرل وغیرہ پر جانا پڑتا ہے۔ ان اعزازات کے مستحق کیڈٹوں کے نام خوبصورت الفاظ میں ٹائپ کر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیے جاتے ہیں۔ شہرت و عزت کی تمنا اور خود کو سرِفہرست دیکھنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی لیکن پی ایم اے میں ہر کوئی ان سے ڈرتا ہے۔ آدھی چھٹی کے دنوں میں کلاسوں سے باہر نکلتے ہوئے ہر کیڈٹ کے دل میں ایک ہی دعا ہوتی ہے۔ "یا اللہ! مجھے شہرت سے بچا! مجھے گوشۂ گمنامی میں جگہ دے!" دھڑکتے دلوں سے کیڈٹ نوٹس بورڈ پر نظریں دوڑاتے ہیں اور جسے اپنا نام نظر آ جائے اس کا منہ لٹک جاتا ہے۔ آدھے دن کی چھٹی ضائع ہونے کے سوگ میں وہ خاموشی اختیار کرتا ہے اور کمرے میں جا کر خوش فعلیوں کے منصوبے بنانے کی بجائے ڈرل سکیٹر جانے کی تیاریاں شروع کر دیتا ہے۔ نوٹس بورڈ پر مختلف کیڈٹوں کے نام جو اعزاز لکھے دکھائی دیتے ہیں، ان کی شانِ نزول، صورتِ نفاذ اور دیگر تفصیلات کچھ یوں ہیں:

ایکسٹرا پریڈ

ڈرل کرتے ہوئے "دائیں پھر" یا "بائیں پھر" کے کاشن پر بقول سٹاف جن کا قدم "ایک کھٹے" کی تاخیر سے اٹھے، جن کے پیر اتنے "نازک" ہوں کہ پی ایم اے روڈ "توڑنے" میں ناکام رہیں۔ ہفتوں ڈرل کرنے کے بعد بھی جن کے پیر سلامت رہیں اور باوجود کوشش کے جن کی ایڑیوں کی آواز سٹاف کے کانوں تک نہ پہنچے وہ اس کے مستحق قرار پاتے ہیں اور آدھے دن کی چھٹیوں میں وہ ڈرل سکیئر میں آکر پریڈ کی مشق بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ اعزاز موقع ہی پر متعلقہ کیڈٹ کو سنا دیا جاتا ہے۔ ڈرل کے پیریڈ میں کوئی مکھی کان پر آ بیٹھی، آپ سے صبر نہ ہو سکا اور اپنی دانست میں نظر بچا کر مکھی اڑا دی لیکن یہ حرکت سٹاف سے پوشیدہ رہنا ناممکن ہے۔ وہ فوراً آپ کی جانب لپکے گا۔ "موونگ آن پریڈ، شاؤٹ یور نمبر صاب!
(پریڈ پر ہوتے ہوئے ہل رہے ہیں، پکاریں اپنا نمبر صاب)

بعض اوقات ڈرل سٹاف کا پارہ کچھ زیادہ ہی چڑھا ہوتا ہے اور وہ کچھ ایسی زبان پر اتر آتا ہے جسے سن کر باچھیں ہیں کہ کھلتی ہی چلی جاتی ہیں لیکن ادھر آپ کے ہونٹ وا ہوتے ادھر سٹاف برسا۔ "سمائلنگ آن پریڈ، شاؤٹ یور نمبر صاب!" (پریڈ پر ہوتے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ پکاریں اپنا نمبر صاب) کسی کیڈٹ کا پاؤں ایک لمحے کی تاخیر سے زمین پر پہنچا اور کھٹاک کی آواز باقی پلاٹون سے جدا ہونے پر پکڑا گیا۔ سلیپنگ آن پریڈ! ریسٹنگ آن پریڈ، شاؤٹ یور نمبر صاب! (پریڈ پر ہوتے ہوئے سو رہے ہیں محو استراحت ہیں۔ پکاریں اپنا نمبر صاب!)

اس طرح پکارے جانے والے تمام نمبر نوٹس بورڈ پر جگہ پاتے اور ان تمام حضرات کو ہفتے اور بدھ کے روز ڈرل سکیئر میں حاضری دینا پڑتی ہے۔

ایکسٹرا رول کال

اردو میں اس کا ترجمہ آپ "زائد حاضری" کر سکتے ہیں۔ لیکن کیڈٹ ایک بار جی سی

آفس میں حاضر ہو جائے تو پھر غیر حاضری کی نوبت مشکل ہی سے آتی ہے۔ یہ رول کالیں کسی کیڈٹ سے چپک جائیں تو پھر اس کا پیچھا آسانی سے نہیں چھوڑتیں مسلسل انڈے بچے دیتی اور اپنی تعداد میں مسلسل اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی والے شاید کبھی آبادی کے اضافے کو روکنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن تاحال کوئی ایسا منصوبہ سامنے نہیں آیا جو پی ایم اے میں کیڈٹوں کے اس روگ کا مداوا کر سکے تفصیل ان کے بڑھنے کی کچھ تو اس زیور کے پہننے میں ہے جسے ایف ایس ایم او (F.S.M.O.) کے نام سے پکارا جاتا ہے اور کچھ ان اشیاء میں جو اس کے بیگ میں ہوتی ہیں۔ ایف ایس ایم او "فیلڈ سروس مارچنگ آرڈر" کا مخفف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فوجی ایسا لباس زیب تن کیے ہوئے ہو جو میدان جنگ میں اس کی ضروریات پوری کر سکے۔ عام زبان میں اسے پٹھو یا جھولا کہتے ہیں۔ یہ ہے تو واقعی بڑی مفید چیز کہ دنیا بھر کی نعمتیں اس میں سمیٹی جا سکتی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پہننے کے بھی کچھ آداب مقرر کر دیے گئے ہیں پشت پر رکھے تھیلے، پہلو میں لٹکے سمال پیک اور پانی کی بوتل کو جسم سے مربوط رکھنے والی پٹیوں (Straps) کے بارے میں حکم ہے کہ دائیں کاندھے سے آنے والی پٹی بائیں شانے پر سے آنے والی پٹی کے اوپر ہو۔ بات ذرا سی ہے لیکن جلدی میں کہاں یاد رہتی ہے۔ نتیجتاً رول کالوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

"ایف ایس ایم او" میں ایک بیگ تو آپ کی پشت پر سوار ہوتا ہے جو کمبل رکھنے کے کام آتا ہے اور راتوں کے وقت آرام دہ بستر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ یہ "بگ پیک" (Big pack) کہلاتا ہے۔ ایک اور تھیلا آپ کی بائیں طرف بیلٹ سے بندھا ہوتا ہے۔ یہ اگرچہ چھوٹا ہوتا ہے لیکن کم بخت جتنا چھوٹا ہے اتنا ہی کھوٹا ہے۔ اس کا نام پنڈورا بکس رکھ دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا کہ ساری خرابیوں اور ایکسٹرا رول کالوں میں اضافے کا سبب یہی بنتا ہے۔ اس میں تولیہ، کینوس کے جوتوں کا ایک جوڑا، پالش کی ڈبیاں، برش، دانت صاف کرنے کی پیسٹ، کنگھا، شیشہ اور اسی طرح کی دیگر کچھ اشیاء ہوتی ہیں جن کی مکمل تعداد چھبیس ہوتی ہے۔ ان اشیاء کی مکمل فہرست آج تک کسی کیڈٹ کو یاد نہیں ہو سکی

تاہم یہ تھیلا کیڈٹ کے شعور و لاشعور پر کس طرح چھایا رہتا ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے کیجیے۔

ایک جنگی مشق کا ذکر ہے ایک چوٹی کو سر کرنے کے بعد کیڈٹ ہانپتے کانپتے اپنا سانس درست کر رہے تھے کہ کچھ سول حضرات افسروں کے ساتھ ان کے سروں پر آن پہنچے اور لگے سوال جواب کرنے۔ انداز بتاتے تھے کہ صحافی ہیں۔ ایک نے ایک کیڈٹ سے پوچھا:

"جب آپ پیش قدمی کر رہے تھے تو آپ کے لاشعور میں کیا تھا؟"

کیڈٹ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پلاٹون کمانڈر کی طرف دیکھا جس نے سر کے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کیڈٹ کو لاشعور کا مطلب سمجھانے کی کوشش کی کیڈٹ نے لاشعور کا مطلب پشت پر سوار تھیلا لیا اور لگا فرفر بولنے:

"سر! پیش قدمی کے وقت میرے لاشعور میں چھبیس چیزیں تھیں۔ کنگھا، تولیہ، شیشہ، تسمے ....."

ہماری معلومات جب ایکسٹرا رول کالوں تک وسیع ہوئیں تو نہایت اہتمام سے ان چھبیس اشیاء کی فہرست تیار کی۔ بڑی دیکھ بھال کے بعد انہیں خریدا اور نہایت احتیاط سے انہیں "سمال پیک" میں رکھ چھوڑا تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

پہلی بار جب ایکسٹرا رول کال ملی تو نہایت اطمینان سے جی سی آفس حاضر ہوئے یہ سوچ سوچ کر دل کو تسلیاں دیتے رہے کہ چلو ایک ہی تو ہے۔ نبھ جائے گی لیکن عین وقت پر پتہ چلا کہ تسموں کی جوڑی تو جی سی لطیف مانگ کر لے گیا تھا اور اس نے واپس ہی نہیں کی۔ یا چھری تو آج صبح بہت سے کیڈٹ بھائیوں کی ناگہانی آمد پر سیب کاٹنے کے لیے نکالی تھی اور واپس رکھنے کا خیال ہی نہیں آیا اور آج لاکھ منع کرنے کے باوجود رولی نے صابن ان اشیاء میں سے نکال کر باتھ روم میں رکھ دیا تھا اور سیدھا اچھوت اشیاء کی یہ فہرست مکمل کرنا اسے یاد نہ رہا تھا۔

حکم ملنے پر ہم نے سمال پیک کھولا، دھلا ہوا تولیہ نکال کر زمین پر بچھایا اور اپنے تمام تر [illegible] کو بروئے کار لاتے ہوئے باقی اشیاء قرینے سے اس پر سجا دیں۔ لیکن [illegible]

ذوق ترتیب کسی کام نہ آیا۔ دیکھا ڈیوٹی سٹاف ہاتھ میں ایک فریم لیے ترتیب شدہ چیزوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایڑیاں اٹھا کر غور سے دیکھا تو انکشاف ہوا کہ ان اشیاء کی ترتیب بھی معین ہے اور سٹاف کے ہاتھوں میں ترتیب شدہ اشیاء کی فریم شدہ تصویر ہے جس سے کیڈٹوں کی چھبیس اشیاء کا موازنہ ہو رہا ہے۔ ترتیب تو دور کی بات تھی۔ ہماری تو چیزیں بھی ایک دو کم ہی تھیں۔ سو مزید تین رول کالیں عطا ہوئیں۔

اس کے بعد ہمارے معمولات میں خاصی تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ عام دنوں میں سورج ڈھلنے کے بعد ہماری پہلی اور آخری خواہش یہی ہوا کرتی تھی کہ نیند کی دیوی کے شانوں پر سر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں لیکن ایکسٹرا رول کالیں تھیں کہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھیں۔ رات کا ایک پہر بیت جانے پر جی سی آفس میں حاضری ضروری ہو گئی۔ تب غروب آفتاب سے طلوع ماہتاب تک کا درمیانی عرصہ کچھ یوں گزرتا کہ

"تکلیف کو تکلیف نہیں آرام کو آرام نہیں"

ایک گھڑی کمر سیدھی کرنے کو لیٹتے تو یہ خدشہ ہوتا کہ آنکھیں مُند گئیں تو الارم بجتا رہ جائے گا لیکن ہمیں جگا نہ سکے گا۔ وقت گزاری کے لیے کینٹین چلے جاتے اور لذیذ جلیبیوں، گلاب جامنوں اور خستہ سموسوں سے جی بہلاتے۔ لیکن بعد میں جی سی آفس میں رول کال کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ یہ ساری چیزیں منہ کو آنے لگتیں۔ سو یہ شغل بھی چھوٹ گیا۔ رول کال سے بہت پہلے "ایف ایس ایم او" کے پچھلے برآمدے میں ٹہلتے رہتے یا خوش قسمت کیڈٹوں کے کمروں میں جھانکا کرتے۔ وقت ہونے پر دوسرے کیڈٹوں کے ہمراہ جوگیوں کی شکل میں اپنی اپنی کمپنیوں سے برآمد ہوتے۔ خوبصورت دالانوں سے گزرتے۔ باغوں کی روشوں پر چلتے اور ہلکی مدھم روشنیوں میں تیرتے۔ اس وقت ہم بالکل الف لیلوی داستانوں کے کردار دکھائی دیتے لیکن ہماری منزل علی بابا کا گھر نہیں ہوتا تھا جہاں خنجر بدست مرجینا نے رقص و سرود کی محفل سجائی ہوتی۔ ہماری منزل تو جی سی آفس ہوا کرتی جہاں مشتاق روشنیوں میں لمبے لمبے شانوں کے سائے نظر آتے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوتا کہ ابھی پریڈ میں کچھ منٹ باقی ہیں۔ تب برفانی راتوں کی کوئی رات ہوتی تو یہ وقت چہل قدمی

کرتے گزار دیتے اور موسم بہار کی کوئی خوشگوار رات ہوتی تو وہ دوسرے کیڈٹوں کے سنگ جی سی آفس کے سامنے والے باغ میں پشت پر سوار جھولے کی ٹیک لگائے ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹ جاتے اور دلچسپ لطیفوں کا دور شروع ہو جاتا۔

پریڈ کی پکار پڑتی تو محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے۔ پہلے حاضری لی جاتی اور پھر پریڈ کا باقاعدہ انعقاد ہوتا۔ انعقاد کی ترتیب ابھی بھی یاد نہ رہ سکی۔ تمام کیڈٹ قطار در قطار کھڑے ہو جاتے۔ ہر کمپنی کا ڈیوٹی سارجنٹ ان کے دائیں کھڑا ہوتا۔ کاشن ملتا "پریڈ شامل!" کیڈٹ باآوازِ بلند "وَن ٹو تھری" "وَن" پکارتے۔ دوسرے "وَن" کے ساتھ ہی ڈیوٹی سارجنٹ اٹن شن (اردو ترجمہ "ہوشیار") کی حالت میں آجاتے۔ کیڈٹ گردان جاری رکھتے۔ "ٹو تھری وَن" "اس" "وَن" کے ساتھ وہ خود ہوشیار ہوتے۔ گنتی جاری رہتی۔ "ٹو تھری وَن" پکارتے اور "سٹینڈ ایٹ ایز" (اردو ترجمہ "آسان باش") کی حالت میں کھڑے ہو جاتے وہ کیڈٹ جن کے مقدر میں عرصے سے یہاں آنا لکھا ہوتا ہے گنتی اور قدموں میں تال میل پیدا کر لیتے لیکن نئے کیڈٹ ان بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جاتے۔ پہلے "وَن ٹو تھری وَن" پر جبکہ ڈیوٹی سارجنٹ کو ہوشیار ہونا ہوتا ہے وہ خود ہوشیار ہو جاتے اور دوسرے "ٹو تھری وَن" پر جبکہ کیڈٹوں کو ہوشیار ہونا ہوتا ہے ایسا کیڈٹ صفوں سے نکل آگے کی جانب روانہ ہو جاتا لیکن ظاہر ہے کہ ابھی پہلا قدم ہی بمشکل اٹھا پاتا کہ ڈیوٹی سارجنٹ کی گرج اس کے قدم منجمد کر دیتی۔

پریڈ کا انعقاد مکمل ہو چکتا تو کیڈٹوں اور ان کے ساز و سامان کا باقاعدہ معائنہ شروع ہوتا۔ کسی پر جھولا ڈھیلا ہونے کا الزام آتا۔ تو کسی پر پانی کی بوتل ادھوری ہونے کی تہمت لگتی اور مزید رول کالوں کا تحفہ عطا ہوتا۔ معائنے کے بعد کچھ کیڈٹ تو روک لیے جاتے کہ ان کے جھولے میں موجود اشیاء کا تفصیلی معائنہ درکار ہوتا۔ باقی "ضروری کارروائی" کے لیے ڈیوٹی کارپورل کے حوالے کر دیے جاتے۔ معائنے کے لیے حکم ہوتا کہ دو منٹ کے اندر اندر تمام اشیاء کو زمین پر سجا دو۔ مشاق اور پرانے کیڈٹ تو فوراً یہ کام کر گزرتے۔ البتہ نئے کیڈٹ یہ دو منٹ اپنی بیلٹ سے سامان یک کھولنے تو لیے بچھانے یا زیادہ سے زیادہ کنکھیوں سے

دائیں بائیں سے کیڈٹوں کی ترتیب دیکھنے میں گزار دیتے۔ اور جب مہلت ختم ہوتی تو ان کی اشیاء کی ترتیب نہ صرف ادھوری رہ جاتی بلکہ بے ہنگم بھی ہوتی۔ چنانچہ انھیں مزید رول کالوں کی نوید ملتی۔ جب انھیں اپنی اپنی دکان بڑھانے کا حکم ملتا (پیک اپ وِدِن ہاف اے منٹ (آدھے منٹ میں سامان بند کرو) تو وہ تمام چیزیں لپیٹ کر بیک وقت تھیلے میں ٹھونسنا چاہتے۔ جلدی میں کسی کا لنگا گر جاتا تو کسی کا آئینہ چٹخ جاتا۔ کبھی تولیا اپنے لیے جگہ نہ پاتا تو کبھی مگ تو اں کو ہاتھ میں اٹھانا پڑتا اور بعد ازاں ان کے تسموں سے انھیں تھیلے کے باہر ہی باندھنا پڑتا۔ اب کچھ اور کیڈٹوں کو یہ عمل دہرانے کا حکم ملتا اور یہ کیڈٹ ڈیوٹی کارپورل کے حوالے کر دیے جاتے ڈیوٹی سارجنٹ حکم دیتا کہ جی سی آفس کے گرد بھاگ کر ایک چکر لگاؤ تو کچھ کیڈٹ دائیں کو بھاگ اٹھتے اور کچھ بائیں جانب کی راہ لیتے۔ موڑ کاٹتے ہی دوڑ ختم ہو جاتی۔ کچھ کیڈٹ کھڑے کھڑے قدم زمین پر بجاتے رہتے کہ دوڑتے قدموں کی دھم دھم بلند ہوتی رہے۔ کچھ اور کیڈٹ زمین سے پتھر اٹھا کر اپنے بیگ سے لٹکے مگ یا پانی کی بوتل بجانا شروع کر دیتے۔ کہ جی سی آفس کے پیچھے سے ابھرنے والی موسیقی صحیح معنوں میں دوڑتے قدموں کی عکاسی کر سکے۔ کچھ دیر بعد دائیں والے کیڈٹ دائیں طرف سے ہی اور بائیں والے کیڈٹ بائیں جانب سے واپس بھاگنا شروع کرتے اور ہانپتے کانپتے "دفتر کے سامنے آجاتے لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر نہیں مناتی۔ آخر کو ڈیوٹی سارجنٹ بھی انھی مراحل سے گزرا ہوتا ہے۔ وقت ختم ہوتا ہے تو پریڈ کے انعقاد کی طرح اس کا اختتام ہوتا ہے اور برخاست کے کاشن پر کیڈٹ جی سی آفس سے غائب ہو جاتے ہیں۔

ایکسٹرا ڈرل

اس کا لفظی ترجمہ تو زائد ڈرل ہی ہونا چاہیے لیکن ڈرل سے اس صنعت کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈرل کرتے ہوئے آپ صرف وردی میں ملبوس ہوتے ہیں لیکن ایکسٹرا ڈرل کے لیے وردی کی بجائے ڈانگری پہننی پڑتی ہے اور اس پر "ایف ایس ایم او" کا اضافہ کرنا پڑتا ہے اس کا پیریڈ بدھ یا جمعے کی شام کو ڈرل اسکوائر میں ہوتا ہے۔ کیڈٹ سارا پیریڈ ایک شاف کے

گردو کولھو کے بیل کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ دوڑتے قدموں کی آواز مدھم ہونے پر شاف کی آواز گونجتی ہے اور کیڈٹ پھر تیز تیز قدموں سے شاف کا طواف شروع کر دیتا ہے۔ پورے پینتالیس منٹ تک مسلسل بھاگتے رہنے کے بعد کیڈٹ کے ذہن سے یہ احساس ہی مٹ جاتا ہے کہ بھاگنا تکلیف دہ امر بھی ہے۔ سو اس کے قدم مشینی انداز میں حرکت کرتے رہتے ہیں اور پیریڈ ختم ہونے کے بعد وہ کچھ ایسے اطمینان سے واپس کمرے کو آتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

شو پریڈ

یہ رول کال ہی کی ایک مہذب شکل ہے اور ان کیڈٹوں کو عطا کی جاتی ہے جن کے بازوؤں پر ایک یا ایک سے زائد فیتی ہو یا دوسرے لفظوں میں وہ عام کیڈٹوں سے بلند ہو کر کارپورل یا سارجنٹ بن چکے ہوں۔ انھیں "ایف ایس ایم او" پہننا پڑتا ہے' نئی ڈانگری محض وردی پہن کر برائے تکلف پریڈ پر آ جاتے ہیں۔

رسٹرکشن Restriction

ایکسٹرا ڈرل اور رول کال کو آپس میں ضرب دے کر پورے دن پر پھیلایا جائے تو اسے "رسٹرکشن" کہتے ہیں۔ اس کی ضرورت عام طور پر اس وقت پیش آتی ہے جب مزاج کچھ زیادہ ہی برہم ہو جائے یعنی کیڈٹ سے کوئی ایسی فاش غلطی سرزد ہو جائے کہ رول کال یا ایکسٹرا ڈرل اس کے ازالے کے لیے ناکافی ہو۔ ان کی تعداد کا تعین غلطی کی سنگینی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ایکسٹرا ڈرل کی سطح سے کچھ ہی بڑی غلطی ہو تو پلاٹون کمانڈر کے ہاتھوں سات دنوں کی رسٹرکشن ملتی ہے۔ پانی سر سے گزر جائے اور بات بٹالین کمانڈر تک جا پہنچے تو اٹھائیس دنوں سے کم میں جان نہیں چھوٹتی۔

یہ اعزاز عطا کرنے کے لیے بھی باقاعدہ ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ پہلی بار جب ہمیں ان مرحلوں سے گزرنا پڑا تو حیرانی سی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ متعلقہ کمانڈر جو

ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے اور جن کے پڑھانے کی اداؤں پر ہم لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے شعلہ بار نگاہوں سے تیوریاں چڑھائے، چہرے پر جلال کی سرخیاں سجائے اور ہماری فردِ جرم سامنے میز پر جمائے دفتر میں بیٹھے تھے۔ کمپنی حوالدار میجر (سی۔ ایچ۔ ایم) ہمیں لیے دفتر سے باہر کھڑا تھا اور ہم سے ایک بے ہنگم سی پریڈ کرائے جاتا تھا۔ اس پریڈ کا نام "قدم تال" کہلاتا ہے۔ (انگریزی میں "مارک ٹائم") اس میں کیڈٹ اپنی جگہ سے ایک انچ آگے بڑھتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے لیکن اس کے باوجود اچھی بھلی سردیوں میں اس کی جبین پسینے سے شرابور ہو جاتی ہے۔ اس پسینے میں کچھ قطرے تو اس مشقت کی وجہ سے نمودار ہوتے ہیں جس میں کیڈٹ مصروف ہوتا ہے۔ اور کچھ قطرے "عرق انفعال" کے ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں موتی سمجھ کر کوئی نہیں چنتا۔ الٹا "سسی گرل" (Cissy girl) (شرمیلی لڑکی) ہونے کی تہمت لگتی ہے کہ کیا لڑکیوں کی طرح گھبرا رہے ہو۔ غلطی کی ہے تو سینہ تان کر مردوں کی طرح نتائج بھی بھگتو نا!

قدم تال کرتے ہوئے جب ہم نڈھال ہو گئے تو سی ایچ ایم نے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ابھی ہم دو قدم ہی چلے تھے کہ خود کو کمانڈر کے دفتر کے عین وسط میں پایا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ مارچ کرتے ہوئے ان کی میز پر چڑھ جائیں یا نیچے سے گزریں کہ کاشن سنائی دیا: "تھم!" ہم نے ہینڈ بریک اور فٹ بریک بیک وقت لگائی اور دونوں ایڑیاں ملائے، ہاتھ جسم سے چپکائے خاموش کھڑے ہو گئے۔ حکم ہوا: "سامنے سلام!" ہم نے سلیوٹ کیا۔ کمانڈر جو ہمیں اچھی طرح جانتے تھے پہچانتے تھے گویا ہوئے "نمبر ۱۳۴۴ جنٹلمین کیڈٹ اشفاق حسین تمھی ہو؟" چاہا فریاد کریں ؎

نہ چھپا نگاہِ ساقی، نہ برت یہ بے نیازی
تیرے پاس آتے ہیں ہم بہت رستے بدل کے

لیکن قصداً خاموش رہے اور اثبات میں جواب دیا۔ فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی اور رسٹرکشن سے نواز دیے گئے۔ پھر سی ایچ ایم کی آواز گونجی "سامنے سلام!" سلیوٹ کیا۔ حکم ملا: "آگے پھر!" ہم نے مڑ کر مخالف سمت کیا اور جلدی جلدی چل کے کاشن پر باقاعدہ مارچ کرتے

ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

اس کے بعد ریسٹرکشن کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلی پابندی تو یہ ہے کہ تمام حواسِ خمسہ کو لہو و لعب میں ضائع کرنے کی بجائے پورے دن کے لیے جی سی آفس کی جانب مرکوز کیا جائے۔ وہاں سے جب بھی بگل کی آواز بلند ہو آپ جہاں بھی ہوں اور جیسے بھی ہوں فوراً لبیک لبیک پکارتے آفس میں حاضر ہو جائیں۔ پکے سے پکے مومن کے دل میں بھی صورِ اسرافیل کا اتنا خوف نہ ہوگا جتنا کیڈٹوں کو اس بگل سے ہوتا ہے۔ صورِ اسرافیل میں تو یہ خاصیت ہوگی کہ وہ اپنی آواز سے اچھے بھلے جاگتے لوگوں کو سلا دے گا لیکن اس آواز کا انتظار اول تو کسی کیڈٹ کو سونے نہیں دیتا لیکن کوئی سو بھی جائے تو آواز سن کر فوراً جاگ جاتا ہے اور آنکھیں ملتا جی سی آفس کو بھاگ اٹھتا ہے۔ اس کے بجنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ڈیوٹی سٹاف جب چاہے اسے پھونک دے اور اس کے بعد چند منٹوں کے اندر اندر متاثرہ کیڈٹوں کی حاضری جی سی آفس میں ضروری ہوتی ہے۔ چھٹی کا دن ہو اور ایک ہی کمپنی کے ایک سے زائد کیڈٹ ریسٹرکشن پر ہوں تو بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک کیڈٹ وردی سمیت بستر میں دراز ہو جاتا ہے اور دوسرا بگل کی آواز پر کان لگائے باہر ٹہلتا رہتا ہے۔ مقررہ وقت کے بعد سونے والے کو جگا دیا جاتا ہے اور جاگنے والا سو جاتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کا ڈکوٹ بن جاتا ہے۔

ایسے کیڈٹوں پر وہ تمام پابندیاں بھی لاگو ہوتی ہیں جو دوسرے کیڈٹوں کو وقتاً فوقتاً ملتی ہیں۔ انھیں ایکسٹرا ڈرل پر جانا پڑتا ہے اور شام کو رول کال پر بھی۔

ان ایکسٹرا رول کالوں، ایکسٹرا ڈرل اور شو پریڈ وغیرہ کی حیثیت سرکاری ہے۔ انھیں باقاعدہ مشتہر کیا جاتا ہے اور ان کا ریکارڈ وغیرہ بھی رکھا جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ بھی کیڈٹوں پر شفقتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے لیکن ان کا کسی بھی کھاتے میں اندراج نہیں ہوتا، کوئی ان کی گنتی نہیں کرتا کہ زیادہ ہونے کی شکل میں ان کے اختتام کی توقع رکھی جا سکے۔ سینئر کیڈٹ، پی ٹی سٹاف، ڈرل انسٹرکٹر اور پلاٹون کمانڈر، کوئی بھی شخص کسی بھی جگہ کیڈٹ کو ان شفقتوں سے نواز سکتا ہے۔ جگہ کی قید ہے نہ وقت کی پابندی۔

سینئر کیڈٹوں کی طرف سے ان کا نزول عام طور پر کسی انٹرویو کے آخر میں ہوتا ہے۔ آپ کتنے ہی ذہین کیوں نہ ہوں ضروری نہیں کہ ہر امتحان سے سرخرو نکلیں اور ہر انٹرویو میں کامیابی ہی آپ کے قدم چومنے کو بے تاب ہو جائے۔ ملاحظہ ہو:

ایک جونیئر کیڈٹ تیز تیز قدم اٹھاتا، جان کی خیر مناتا، اپنے کمرے کی جانب لپکا چلا جا رہا ہے۔ اچانک سینئروں کے ایک غول سے پالا پڑ گیا۔ کیڈٹ کو ٹھہرا لیا گیا۔ انٹرویو شروع:

"تم لاہور کے ہو؟"

"یس سر!"

"مجھے پہچانتے ہو؟"

"نو سر!"

"ہائیں! تم لاہور کے ہو کر سر کو نہیں پہچانتے؟" ایک اور سینئر کیڈٹ سراپا احتجاج بن گئے — "سر بھی تو لاہور کے رہنے والے ہیں۔"

اب ہم سر کو کیسے بتاتے کہ لاہور اب وہ لاہور نہیں رہا جس کا کوئی حدود اربعہ ہوا کرتا تھا۔ پطرس کے زمانے سے طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے بلکہ پطرس کی جن ماہرین سے واقفیت تھی ان کے اندازے کے مطابق وہ دن دور نہیں جب لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالحکومت پنجاب ہوگا — لیکن سر کے ذہن میں جو لاہور موجود تھا وہ تو وہ تھا جہاں کا ہر شہری انھیں پہچانتا تھا۔ ہمارا انھیں نہ پہچاننا جرم ٹھہرا اور حکم صادر ہوا "اوان دی ہینڈز ڈاؤن!"

اس کاشن کے معنی ہم آپ کو سمجھائے دیتے ہیں۔ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر دینے کی دھمکی سننے کو تو ہر جگہ مل جاتی ہے لیکن اس کے عملی مظاہرے صرف پی ایم اے میں ملتے ہیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ کیڈٹ ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر ڈنٹر پوزیشن اختیار کر جاتا ہے اور تا حکمِ ثانی اسی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی مقبولیت کی وجوہات پر غور

کرنے کے بعد ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ پی ٹی اسٹاف یہ سزا اس لیے دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس آسن سے ہاتھوں کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں اور باکسنگ میں جیت کے امکان زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈرل انسٹرکٹر کے نزدیک یہ "حرکت" اس لیے ضروری ہے کہ بازوؤں کی مچھلیاں مضبوط ہوتی ہیں۔ اور ڈرل کے پیریڈ میں ایک ہاتھ سے نہ صرف رائفل مضبوطی سے تھامی جا سکتی ہے بلکہ دوسرا بازو کندھے کی لائن میں آسانی سے ہلایا جا سکتا ہے۔ پلاٹون کمانڈر اپنے کیڈٹوں کو اس شغل میں اس لیے مصروف دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس سے سالانہ نشانہ بازی کے وقت رائفل کی درست پکڑ میں آسانی پیدا ہوتی ہے اور سینئر کیڈٹ یہ سزا اس لیے سناتے ہیں کہ جلدی میں ان کے پاس کوئی اور سزا دینے کا وقت نہیں ہوتا۔

جھوم شرابی جھوم

کیڈٹ کو یہ کاشن انگریزی کے الفاظ اسٹارٹ سپننگ (Start Spinning) کی شکل میں ملتا ہے اور اس پر عمل درآمد کی صورت یہ ہے کہ کیڈٹ اپنے بازو اپنے پہلوؤں کی جانب پھیلاتا ہوا کونج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور کسی ایک جانب لٹو کی مانند گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے ماہرین طبقات الارض کی یہ رائے سو فی صد درست معلوم ہونے لگتی ہے کہ زمین گول ہے اور اپنے محور کے گرد ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ کیڈٹ خود کو محور محسوس کرتا ہے اور رک جانے کا کاشن مل جانے کے کئی لمحوں بعد تک چاہتے ہوئے بھی زمین کی گردش اس کے ہاتھوں رک نہیں پاتی۔ اسے جب چلے جانے کی رخصت عطا ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے منزل سے بیگانہ کوئی رند ساری رات جام پہ جام لنڈھا کر میخانے سے نکلا ہو ؎

دیوانہ جا رہا ہے شب غم گزار کے

لڑھک جا گیند کی مانند اور فٹ بال بن کیڈٹ

جبین نیاز دونوں ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر پورے جسم سمیت زقند لگانے کو قلابازی کہتے ہیں اور فرنٹ رول کے کاشن پر قلابازیاں لگانا کیڈٹ کا روزمرہ کا معمول ہے۔ بچپن میں رضائیوں اور لحافوں کا ستیاناس کرنے اور اکیڈمی میں گدیلوں کے بغیر قلابازیاں لگانے میں بڑا فرق ہے۔

بنا بستر سٹرک کو اعصاب آرام کر کیڈٹ

یہ کاشن بھی پی ایم اے کی ابتدائی زندگی میں زیادہ سنائی دیتا ہے۔ نئے کورس کی آمد کے موقع پر خاص طور پر ان نوواردوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو یوڈی کلوز میں نکھرے ستھرے جین سوٹ زیب تن کیے ماتھوں پر بالوں کی لٹیں سجائے اک شانِ دلربائی کے ساتھ اکیڈمی میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو انٹر سروسز سلیکشن بورڈ (I.S.S.B.) کے امتحان پاس کرنے کے بعد خود کو افسری کے عہدوں پر فائز اور بلندیوں پر محوِ پرواز رکھتے ہیں۔ انہیں واپس زمین کی سطح پر لانے کے لیے حکم ملتا ہے "لائی ڈاؤن اون دی گراؤنڈ" (زمین پر لیٹ جاؤ) نووارد کبھی اپنے نئے سوٹ کو دیکھتا ہے اور کبھی کیچڑ بھری زمین کو۔ ایک بار ایک نووارد نے رحم کی درخواست دائر کی "سر! یہ سوٹ میں نے نیا ہی سلوایا ہے۔" اور متعلقہ سینئر سراپا احتجاج بن گئے۔

"تمھارا کیا خیال ہے، جب ہم اکیڈمی آئے تھے تو لنڈے بازار کے سوٹ خرید کر لائے تھے۔ لائی ڈاؤن۔"

کپڑوں کا بدلنا جلدی میں،

بظاہر یہ ایک سیدھا سادا بے ضرر سا حکم نظر آتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ پیریڈ ختم ہونے کے بعد آپ کی تمنا نرم گرم بستر کو تصور میں جاکے

وردی ڈالنے کمرے کی طرف جاتے ہیں کہ کسی سینئر کو آپ کی کوئی ادا ناخوشگوار گزری اس نے حکم داغ دیا کہ جاؤ دو منٹ کے اندر اندر پی ٹی کٹ پہن کر آؤ۔ آپ تیر کی طرح کمرے میں جاتے ہیں۔ وردی کو بے دردی سے اتارتے ہیں، وارڈ روب کھولتے ہیں، نیکر اور آدھے بازوؤں والی قمیص پہنتے ہیں اور کنویس کے جوتوں کے تسموں کے ساتھ ساتھ آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر بھی کستے جاتے ہیں۔ منتشر سانسوں کے ساتھ جب آپ سر کو رپورٹ کرتے ہیں تو وہ ایک ادائے بے نیازی سے مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں "تم پی ٹی کٹ میں بھلے نہیں دکھائی دیتے۔ جاؤ سول کپڑے پہن کر آؤ۔" اکیڈمی میں سول کپڑوں سے مراد بھی ایک خاص یونیفارم ہے۔ سفید قمیص، گرے رنگ کی پتلون، پی ایم اے کی مخصوص ٹائی اور بلیزر۔ آپ ہانپتے کانپتے کمرے میں پہنچتے ہیں۔ پی ٹی کٹ سے خود کو آزاد کرتے ہیں اور قمیص پہن ٹائی کی گرہ کبھی کھولتے ہیں کبھی باندھتے ہیں۔ جلدی میں جلدی۔ وہ کسی طرح ٹھیک بیٹھ ہی نہیں پا رہی۔ خدا خدا کرکے آپ دوبارہ سر کے ہاں جاتے ہیں تو حکم صادر ہوتا ہے "ہاں! کچھ بہتر ہے لیکن تم وردی ہی میں جچتے ہو۔ جاؤ وردی پہن کر آؤ۔" آپ وردی پہن کر آتے ہیں تو سر کی طرف سے رخصت عطا ہوتی ہے۔ اب کمرے میں آکر ہوش آنے پر یوں لگتا ہے جیسے یہ اپنا کمرہ نہیں لانڈری کی دکان ہے۔

جی سی آفس میں رات کی حاضری کے وقت تجربہ کار کیڈٹ ڈانگری کے نیچے پی ٹی کٹ پہن لیتے ہیں اور جب وہاں سے حکم صادر ہوتا ہے کہ پی ٹی کٹ پہن کر آؤ تو وہ کمرے کو جانے کی بجائے راستے کے اندھیروں میں ڈانگری اتار کر کسی جھاڑی میں رکھ چھوڑتے ہیں اور فوراً جی سی آفس پہنچ جاتے ہیں جہاں سے جلدی آنے کی وجہ سے ان کی خلاصی ہو جاتی ہے۔ نوآموز کیڈٹ بیچارے جی سی آفس اور کمروں کے درمیان پھیروں پہ پھیرے لگاتے تھکتے ہیں۔

شام سے معذرت کے ساتھ

وہ سرد سنگی سی راتیں

کمروں کے پھیروں پہ پھیرے
کپڑوں کا بدلنا جلدی میں
کیڈٹ کو پریشانی گھیرے
آجائے جو کوئی ایس جی سی[1]
افسانے یونہی تیرے میرے
بیتے چھوٹے کچھ دن ایسے ہیں
تنہائی جنہیں دہراتی ہے

لکھتا جا گھبراتا جا

ہم لکھنے پڑھنے سے گھبرا کر فوج میں آتے تھے لیکن یہاں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات تھی۔ شروع شروع میں تو کیڈٹوں کے لیے یہ روزمرہ کا معمول ہے کہ ادھر کوئی غلطی ہوئی ادھر حکم ملا کہ ہزار بار لکھو "میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔" نوٹس بورڈ پر کسی کیڈٹ کے لیے کوئی ہدایت لکھی تھی۔ اس نے نوٹس بورڈ ہی نہیں پڑھا۔ حکم ہوا ہزار بار لکھو، "آئندہ پیریڈ ختم ہونے کے بعد میں اس وقت تک کمرے میں نہیں جاؤں گا جب تک بورڈ نہ پڑھ لوں۔" پلاٹون کمانڈر نے ایک صفحے کا لکھنے کا کوئی کام دیا تھا۔ کیڈٹ سے بھول ہو گئی۔ حکم ہوا ہزار بار لکھو "آئندہ میں گھر کا کام باقاعدگی سے کیا کروں گا۔" اب ایک صفحے کی بجائے بیسیوں صفحات لکھے جا چکے ہیں لیکن گھر کا کام ختم نہیں ہو پا رہا۔ مزید ایک ہزار فقرے لکھنے کی سکت باقی نہیں۔ لیکن یہ کام مکمل کرنا ضروری ہے چاہے رت جگا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک دن میں آپ کے ذمے کئی کئی ہزار فقرے ہیں۔ ایک ہزار فقرے آپ نے پلاٹون کارپورل کو لکھ کر دینے ہیں۔ دو ہزار پلاٹون کمانڈر کا قرض ہے اور ہزار پانچ سو کسی اور

---

[1] سینئر جنٹلمین کیڈٹ

کو واجب الادا ہیں۔

اس روایت کے رواج کی ذمہ داری ان ماہرینِ نفسیات کے سر پہ ہے جن کے بقول کوئی بات بار بار دہرانے سے وہ انسان کے ذہن میں اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ پھر بھلائے نہیں بھولتی۔

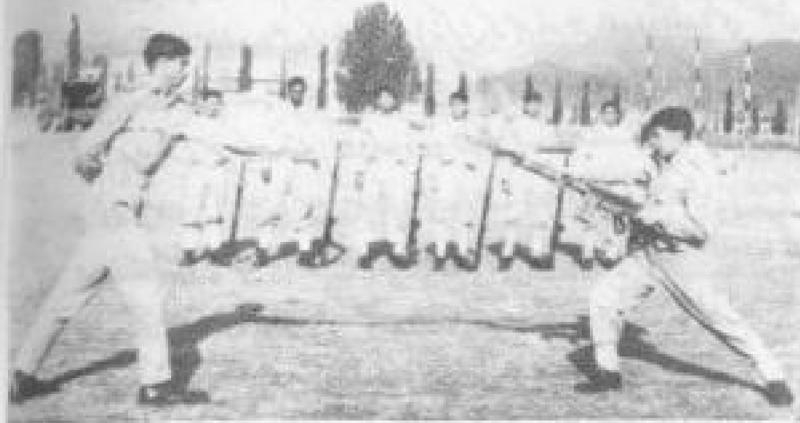
سینئروں کی طرف سے مندرجہ بالا احکامات ہی صادر نہیں ہوتے، شفقتوں کا نزول بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر احکامات کی تکمیل کے بعد سینئر پوچھتے ہیں "اب کیا چاہتے ہو؟" بس یہاں جونیئر ذرا سی ہمت کا مظاہرہ کرے تو اس کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ لبوں پر تھوڑی سی مسکراہٹ پیدا کرے اور ایک لفظ کہہ دے "سر! فروٹ شاپ!" سر آپ کو فروٹ شاپ لے جائیں گے۔ وہاں آپ وٹامن سی کی کمی پورا کرنے کے لیے مالٹے کھائیں۔ فولاد کی سطح قائم رکھنے کے لیے سیب کھائیں، فرحت و تازگی کے لیے سکواش پئیں، روح افزا استعمال کریں یا جوس سے کھوئی ہوئی قوت کو بحال کریں۔ سینئر چوں نہیں کریں گے۔ اس کے بعد بھی گنجائش باقی ہو تو کہیں، "سر اب ذرا کنٹین چلیں۔" سر آپ کو کنٹین لے جائیں گے۔ وہاں جا کر آپ سیروں کے حساب سے جلیبیاں چبائیں، درجنوں گلاب جامنیں نگل جائیں، سموسوں کا ستیاناس کر ڈالیں یا چائے پہ چائے لنڈھائیں۔ بجٹ آپ کا نہیں اس "سر" کا خراب ہو گا جس نے آپ سے آخری خواہش پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

کنٹین ویسے بھی جائے اماں ہے۔ آپ گھر سے آئے ہوئے بھائی بہنوں، دوستوں یا کسی کزن کے ساتھ کنٹین میں بیٹھے ہوں یا باہر سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہوں تو کوئی سینئر آپ کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔

روزمرہ کے مشاغل سے استثنا کی ایک اور جگہ مسجد ہے۔ یہاں شور کرنا منع ہے۔ یہاں تک کہ جونیئروں کی طرف سے سینئروں کو سلام کرنے پر بھی پابندی ہے۔ اگر آپ نے عادت سے مجبور ہو کر سلام کر ڈالا تو سینئر بڑے پیار سے آپ کو کہیں گے، "ذرا باہر چلنا۔" باہر لے جا کر پہلے بیان کی گئی تمام مشقوں کی دہرائی کی جاتی ہے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہم مسجد میں جا رہے تھے۔ گیٹ پر پہنچے تو ایک سینئر اندر سے باہر آ رہے تھے۔ ہم تذبذب میں کہ سلام کریں یا نہ کریں کہ ہم باہر ہیں اور وہ اندر۔ اسی کشمکش میں ہم بڑھتے چلے گئے۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہوئی کہ ہمارا ایک قدم مسجد کے اندر ایک قدم باہر اور سر کا بھی ایک قدم اندر ایک باہر۔ وہ اچانک رک گئے۔ ہمارے قدم بھی منجمد ہو گئے۔ انھوں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں جیسے پوچھ رہے ہوں، "کیوں نہیں کیا تم نے سلام؟" ہم نے قدموں کی جانب نگاہ دوڑائی اور جلدی سے اپنا باہر والا قدم اندر کھینچ لیا اور ان کی جانب ملتجی نظروں سے دیکھا جیسے جواب دیا ہو، "سر! میں مسجد کے اندر ہوں۔" ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے کہہ رہے ہوں، "جاؤ معاف کیا۔"

آپ کسی سینئر کے ساتھ جا رہے ہوں تب بھی کوئی اور سینئر آپ کو اچک نہیں سکتا۔ کسی سینئر کا دل بہت ہی مچلنے لگے یا ان کے حلق کے عضلات پھڑک رہے ہوں آپ کو دو سنانے کے لیے تو پہلے وہ اس سینئر سے اجازت لے گا جس کے زیرِ سایہ آپ جا رہے ہوں لیکن اس کی نوبت کم ہی آتی ہے۔



شمشیر و سنان اوّل ↑

طاؤس و رباب آخر ↓



یہ تھے ہمارے اساتذہ کرام

ارسطو نے کہا تھا کہ استاد کا درجہ انسان کی زندگی میں باپ سے بھی بلند تر ہے کہ باپ انسان کو آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور استاد انسان کو زمین کی پستیوں سے نکال کر آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ معراجِ انسانیت کی رفعتوں سے روشناس کراتا ہے اور جہالت کے اندھیاروں میں علم کے چراغ لیے روشن منزلوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اساتذہ کے حوالے سے ذہن کے دریچوں میں یادوں کے چراغ جل اٹھے ہیں اور ان میں کتنے روشن چہرے جگمگا رہے ہیں ؎

کیسے کیسے لوگ نجانے کدھر گئے
اس دل کی انجمن کے ستارے بکھر گئے
تھا جن کا ذکر کل تک اس شہرِ فکر میں
وہ بھی تو آج چھوڑ کے جانے کدھر گئے

پرائمری سکول کے شریف صاحب تھے کہ جن کے ساتھ پہلی بار ہم نے ایک جلسے میں شرکت کی اور اس وقت کے صدر پاکستان محترم فیلڈ مارشل ایوب خان کی پہلی تقریر سنی۔ ماسٹر علاء الدین تھے جنھوں نے ہمارے ٹیچر کی چھٹی پر ہماری کلاس لی تھی اور ہمیں "ص" لکھنا سکھایا تھا۔ ہیڈ ماسٹر اسلم صاحب تھے جنھوں نے ایک بار ہم سے مغربی پاکستان کی پیداوار پوچھی تھی اور "گنا اور میدہ" کا جواب سن کر سیخ پا ہو گئے تھے۔ ہمارا علم گنے اور میدے تک یوں محدود تھا کہ نارنگی بازار جہاں شروع ہوتا ہے وہاں کبھی محکم دین کی ایک بیکری ہوا کرتی تھی۔ وہ پیٹریوں کے لیے مشہور تھی اور ہم انھیں کھانے کے لیے بدنام اور پیٹریاں

میدے سے ملتی ہیں۔ پھر پرانی انارکلی اور نئی انارکلی کے درمیان جو رستہ ہے پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہاں گنے کے رس کے کئی بیلنے تھے۔ یہ بیلنا ٹر صاحب کی بیع پالی کے بعد کی بات ہے کہ ہمارا علم انارکلی کے بازاروں سے بلند ہو کر مغربی پاکستان تک وسیع ہوا۔

ہائی سکول میں اردو کے ٹیچر عبدالحمید صاحب تھے۔ وہ لیٹ آنے پر اکثر ہماری پٹائی کیا کرتے تھے لیکن ہم نے اپنی خو چھوڑی نہ انھوں نے اپنی وضع بدلی۔ اردو پڑھاتے تو بڑے پیار کے ساتھ۔ کبھی کبھار شعر سنایا کرتے۔ اکثر گنگناتے۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

فارسی کے سب سے پہلے شعر جو انھوں نے ہمیں سنائے اور سکھائے وہ یہ تھے۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد
کشش کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیساں
بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

وفا کے پتلے حساب کے ٹیچر غلام نبی تھے کہ جن کے بارے میں کلاس کو یہ حسرت رہی کہ کبھی تو وہ حساب کتاب کے علاوہ کوئی بات کریں گے لیکن وہ آتے ہی کہتے، "لکھو سوال" اور پوری کلاس ان دو لفظوں سے ایسے سحر زدہ ہو جاتی کہ فوراً کاپیاں پنسلیں باہر نکل آتیں اور سوال لکھنا شروع کر دیتی۔ وہ ایک بار حج کر کے آئے تو فیصلہ ہوا کہ ان سے حج کی باتیں کی جائیں۔ وہ آئے ہم نے مبارک باد دی اور باتوں میں لگانا چاہا لیکن انھوں نے چٹاخ سے فقرہ چھوڑا، "لکھو لکھو۔ لکھو سوال۔" اور پوری کلاس سوال لکھنے لگی۔

انگلش کے ٹیچر خالد سلطان تھے کہ جنھوں نے ایک امتحان میں پچیس نمبر لینے پر ہماری کمال ادھیڑی اور پوچھا، "یہ جو ستر ستر نمبر لیتے ہیں، ان الو کے پٹھوں کے چار چار کان اور

اور چار چار آنکھیں ہیں کیا؟"

جانے کیا کیفیت تھی، بات دل میں اتر گئی۔ ایک وقت آیا جب ہم نے بھی ستر نمبر لیے لیکن انھوں نے پھر بھی شوخی سے چیختے ہوئے ماتھے پر تڑاخ سے بید جمایا، "الو کا پٹھا، ستر نمبر کیوں لیے، اکہتر کیوں نہیں؟"

ماسٹر عبدالرحمٰن تھے جنھوں نے ہمیں فارسی پڑھائی اور جو ہر پیراگراف کے ساتھ ایک لطیفہ سناتے تھے۔

کالج میں شہرت بخاری تھے جب یاد آتے ہیں کلیاں سی چٹکنے لگتی ہیں، پھول سے کھلنے لگتے ہیں، گجرے مہکنے لگتے ہیں اور ایک عجیب سرور آمیز جلترنگ سا بجنے لگتا ہے۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ شاعری سمجھاتے ہوئے انھوں نے وفاؤں کی کتنی ہی داستانیں سنائیں، جفاؤں کے کتنے ہی روپ گنائے اور دل کے نازک احساسات کی کہانیاں سوز میں ڈوب ڈوب کر سنائیں جو عملی زندگی کے ہر گام پر ابھر ابھر کر سامنے آتی ہیں تو کوئی شہرت بخاری سا رہبر نہیں ملتا۔ ان کا ایک شعر جو گورنمنٹ کالج پشاور کے جناب شمر نعمانی کی زبانی ہم نے سنا ۔

اب کے دل سنبھل جائے، یہ درد تھم جائے
قسم ہے پھر میں کسی آرزو کا نام نہ لوں

بی اے میں انگلش کے پروفیسر سرور قریشی تھے کہ کھلی آنکھوں ہماری دو سال کی آوارہ گردیاں اور حماقتیں دیکھتے رہتے تھے، پھر بھی ایک دن بھری کلاس میں ہمارے بارے میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ یہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گا۔ اس وقت تک ہم اس سال امتحان میں نہ بیٹھنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن پھر ان کے الفاظ کا پاس رکھنے کو ہمیں امتحان دینا پڑا اور ربِ ذوالجلال نے ان کے کہے کی لاج رکھ لی۔ ہمارا پورا ایک سال بچ گیا اور کتنے ہی سال سنور گئے۔ سچ ہے بھری کلاس میں کھڑے استاد کے لبوں سے نازل ہوتے الفاظ بعض اوقات طلبہ کی زندگیوں کے فیصلے کر رہے ہوتے ہیں۔ تحسین کا ایک لفظ، شاباش کی ایک تھپکی، پیار کی اک نظر اور شفقت کی ایک نگاہ،

ایک طالب علم کو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی سے نکال کر جگمگاتے حوصلوں کے نئے راستوں پر گامزن کر دیتی ہے۔

اس سلسلے کو ہم یہیں چھوڑتے ہیں کہ اس باب کا موضوع پی ایم اے کے اساتذہ کرام ہیں جن کا ذکر ہم تفصیل سے کریں گے۔ اکیڈمی میں اساتذہ کو ماسٹر، ٹیچر یا پروفیسر نہیں کہتے بلکہ انسٹرکٹر یا کمانڈر کہتے ہیں۔

ان میں تھے میجر ظفر مصطفےٰ، پورے کورس کے انچارج۔ بعد میں ہمارے کمپنی کمانڈر بھی رہے۔ آج کل کرنیل بنے کہیں لوہے کی توپوں اور ان کے توپچیوں کو کمانڈ کر رہے ہیں لیکن ان دنوں ان کی حکمرانی تھی۔ ہم کیڈٹوں پر کہ جسمانی لحاظ سے تو لوہا تھے لیکن دل و دماغ پگھل کر موم ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تھا کہ ہمیں لوہے کے سپاہیوں میں بدل دیتے یا وطن کے پرستاروں میں اور ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے کیوپڈ کی طرح دلوں پر حکمرانی کی اور ایک جگہ پاش کمانڈر کی طرح کیڈٹوں کو سپاہیوں سے بدلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

شروع شروع میں تو وہ کیڈٹوں کے مسیحا تھے۔ جب توڑ پھوڑ کا عمل جاری تھا اور ہمیں کچھ سمجھ نہ آتی کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو وہ شمع امید بن کر جھلملاتے۔ کیڈٹ ان کے سامنے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے اور ان "زیادتیوں" کا رونا روتے جو سینئروں نے ان پر روا رکھی ہوتی تھیں۔ تب ان کی تجاویز پر احکامات جاری ہوتے۔ سینئروں کے لیے جونیئروں کو ستانا جرم ٹھہرتا۔ کچھ دن سکون رہتا لیکن پھر کسی تقریب میں کیڈٹوں کے ہاتھوں کوئی ناقابل معافی جرم (تقریروں کے دوران کھانسی یا وقفے کے بعد نشستیں سنبھالتے ہوئے کرسیوں کی کھڑکھڑاہٹ وغیرہ) سرزد ہو جاتا۔ ظاہر ہے قصوروار جونیئر کیڈٹ ٹھہرائے جاتے اور سینئروں کو پھر سے کھل کھیلنے کی چھٹی مل جاتی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا تسلسل آج بھی پی ایم اے میں جاری ہوگا۔ بات ہو رہی تھی میجر ظفر کی کہ کیڈٹوں کے دکھوں کا مداوا تھے۔ مصطفےٰ زیدی مرحوم کی زبان میں:

"اس نے سیپوں کی طرح ہم کو سنبھالے رکھا

لیکن ڈر تھا

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

والی لڑائیاں زیادہ دن تو نہ چل سکتی تھیں۔ ادھر ہمارے دن پھرنا شروع ہوئے ادھر ان کا پارہ چڑھنا شروع ہوا۔ وہ مصطفےٰ کہ ہر دکھ کا علاج نظر آیا کرتے اتنے سخت گیر ہو گئے کہ ان کے سامنے جانے سے جان جایا کرتی۔ خود کہا کرتے کہ جب تم نادان تھے تو تمہاری غلطیوں پر ہم انجان بنتے رہے لیکن اب تو ہر جرم گردن زدنی تھا۔

اور یہ آخری دور ہی میں سے ایک دن کی بات ہے۔ سینڈ ماڈل (Sand Model) پر کسی جنگی مشق کا سبق چل رہا تھا۔ ایک دن پہلے ماڈل پر "جنگی علاقے" کی تفصیل سمجھائی گئی۔ ان جگہوں کی نشاندہی کی گئی جہاں "دشمن" مورچہ بند تھا۔ اپنی دفاعی "صورت حال" پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی اور کیڈٹوں کو کہا گیا کہ دوسرے روز وہ "ہر قسم کی صورت حال" سے نمٹنے کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ دوسرے کیڈٹوں کے ساتھ مل کر ہم رات گئے نقشوں کی بھول بھلیوں میں الجھے رہے۔ متعلقہ کتابوں کو کھنگالتے رہے اور بہت سے مرحوم جرنیلوں کی روحوں کو بے چین کرنے کے بعد بالآخر کچھ جنگی چالیں مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن ہم اپنی ذمہ داری کے "علاقے" کے چپے چپے سے واقف تھے اپنی دفاعی صورت حال نہ صرف مستحکم تھی بلکہ "دشمن" کو تہس نہس کرنے اور آگے بڑھ کر اپنی مرضی کے علاقے میں اسے بھسم کرنے کی تدابیر بھی بڑے غور و خوض سے تیار کر رکھی تھیں۔ اصل سبق شروع ہونا ابھی باقی تھا کہ اچانک ہم نے خود کو میجر ظفر مصطفےٰ کا مخاطب پایا۔ آنے والی "صورت حال" پر غور کرنے میں ہم اس قدر منہمک تھے کہ سوال سن ہی نہ سکے۔ گڑبڑا کر ہم نے ادھر ادھر دیکھا۔ میجر ظفر نے کہنے کو تو سوال دہرا دیا۔ کہ وہ فرسٹ لائٹ (First light) اور لاسٹ لائٹ (Last light) کے اوقات پوچھ رہے ہیں۔ لیکن ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ہمارے "تغافل" پر ان کا پارہ صبر کی تمام حدیں پھلانگ چکا ہے۔

ایک طالب علم کو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی سے نکال کر جگمگاتے حوصلوں کے نئے راستوں پر گامزن کر دیتی ہے۔

اس سلسلے کو ہم یہیں چھوڑتے ہیں کہ اس باب کا موضوع پی ایم اے کے اساتذہ کرام ہیں جن کا ذکر ہم تفصیل سے کریں گے۔ اکیڈمی میں اساتذہ کو ماسٹر، ٹیچر یا پروفیسر نہیں کہتے بلکہ انسٹرکٹر یا کمانڈر کہتے ہیں۔

ان میں تھے میجر ظفر مصطفےٰ، پورے کورس کے انچارج۔ بعد میں ہمارے کمپنی کمانڈر بھی رہے۔ آج کل کرنل بنے کہیں لوہے کی توپوں اور ان کے توپچیوں کو کمانڈ کر رہے ہیں لیکن ان دنوں ان کی حکمرانی تھی۔ ہم کیڈٹوں پر کہ جسمانی لحاظ سے تو لوہا تھے لیکن دل و دماغ پگھل کر موم ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تھا کہ ہمیں لوہے کے سپاہیوں میں بدل دیتے یا وطن کے پرستاروں میں اور ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے کیوپڈ کی طرح دلوں پر حکمرانی کی اور ایک جگر پاش کمانڈر کی طرح کیڈٹوں کو سپاہیوں سے بدلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

شروع شروع میں تو وہ کیڈٹوں کے مسیحا تھے۔ جب توڑ پھوڑ کا عمل جاری تھا اور ہمیں کچھ سمجھ نہ آتی کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو وہ شمعِ امید بن کر جھلملاتے۔ کیڈٹ ان کے سامنے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے اور ان "زیادتیوں" کا رونا روتے جو سینیئروں نے ان پر روا رکھی ہوتی تھیں۔ تب ان کی تجاویز پر احکامات جاری ہوتے۔ سینیئروں کے لیے جونیئروں کو ستانا جرم ٹھہرتا۔ کچھ دن سکون رہتا لیکن پھر کسی تقریب میں کیڈٹوں کے ہاتھوں کوئی ناقابلِ معافی جرم (تقریروں کے دوران کھانسی یا وقفے کے بعد نشستیں سنبھالتے ہوئے کرسیوں کی کھڑکھڑاہٹ وغیرہ) سرزد ہو جاتا۔ ظاہر ہے قصوروار جونیئر کیڈٹ ٹھہرائے جاتے اور سینیئروں کو پھر سے کھل کھیلنے کی چھٹی مل جاتی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا تسلسل آج بھی پی ایم اے میں جاری ہوگا۔ بات ہو رہی تھی میجر ظفر کی کہ کیڈٹوں کے دکھوں کا مداوا تھے۔ مصطفےٰ زیدی مرحوم کی زبان میں:

"اس نے مجبوروں کی طرح ہم کو سنبھالے رکھا ــ

لیکن خود

آئیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

والی ترکیبیں زیادہ دن تو نہ چل سکتی تھیں۔ ادھر ہمارے دن پڑھنا شروع ہوئے ادھر ان کا پارہ بڑھنا شروع ہوا۔ وہ مصطفےٰ کہ ہر موڑ کا حلال نظر آیا کرتے اتنے سخت گیر بن گئے کہ ان کے سامنے جانے سے جان جایا کرتی۔ خود کہا کرتے کہ جب تم نادان تھے تو تمہاری غلطیوں پر ہم انجان بنتے رہے لیکن اب تو ہر جرم گردن زدنی تھا۔

اور یہ آخری دور ہی میں سے ایک دن کی بات ہے۔ سینڈ ماڈل (Sand Model) پر کسی جنگی مشق کا سبق چل رہا تھا۔ ایک دن پہلے ماڈل پر "جنگی علاقے" کی تفصیل سمجھائی گئی۔ ان جگہوں کی نشاندہی کی گئی جہاں "دشمن" "مورچہ بند" تھا۔ (اپنی دفاعی "صورتِ حال" پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی اور کیڈٹوں کو کہا گیا کہ دوسرے روز وہ "ہر قسم کی صورتِ حال" سے نپٹنے کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ دوسرے کیڈٹوں کے ساتھ مل کر ہم رات گئے نقشوں کی بھول بھلیوں میں الجھے رہے۔ متعلقہ کتابوں کو کھنگالتے رہے اور بہت سے مرحوم جرنیلوں کی روحوں کو بے چین کرنے کے بعد بالآخر کچھ جنگی چالیں مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن ہم اپنے ذمہ داری کے "علاقے" کے چپے چپے سے واقف تھے۔ اپنی دفاعی صورتِ حال نہ صرف مستحکم تھی بلکہ "دشمن" کو تہس نہس کرنے اور آگے بڑھ کر اپنی مرضی کے علاقے میں اسے بھسم کرنے کی تدابیر بھی بڑے غور و خوض سے تیار کر رکھی تھیں۔ اصل سبق شروع ہونا ابھی باقی تھا کہ اچانک ہم نے خود کو میجر ظفر مصطفےٰ کا مخاطب پایا۔ آنے والی "صورتِ حال" پر غور کرنے میں ہم اس قدر منہمک تھے کہ سوال سن ہی نہ سکے۔ گڑبڑا کر ہم نے ادھر اُدھر دیکھا۔ میجر ظفر نے کہنے کو تو سوال دہرا دیا۔ کہ وہ فرسٹ لائٹ (First light) اور لاسٹ لائٹ (Last light) کے اوقات پوچھ رہے ہیں۔ لیکن ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ہمارے "تغافل" پر ان کا پارۂ صبر کب کا تمام حدیں پھلانگ چکا ہے۔

یہ فوج کی ایک اصطلاح ہے۔ پہلی روشنی (First light) سحر کے لیے اور آخری روشنی کی اصطلاح غروب آفتاب کے وقت کے لیے استعمال کی جاتی ہے تقریباً ہر پلاننگ ان اوقات کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کہ گھبرا کر ہم نے سبق کے اوقات سحر و غروب آفتاب بتانے کے ان دونوں کے اصل اوقات طلوع و غروب بتانے شروع کر دیے۔ بس پھر کیا تھا میجر ظفر مصطفےٰ بپھر گئے۔ پہلے تو ملکی صحافت کے حوالے سے انھوں نے ہمارے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی، پھر فوج میں ہمارے مستقبل کے بارے میں کچھ ایسی پیشین گوئیاں فرمائیں جن کے مطابق ہمارا کیریر تو خاصا تابناک تھا لیکن فوج کے ساتھ ہم جو کچھ کرنے والے تھے۔ اس کے تصور ہی سے شرافت کانپ کانپ جاتی۔

کافی طویل تقریر کے بعد وہ جب واپس آتے تو ہم تو پسینے سے شرابور تھے ہی، باقی کورس کی سٹی بھی گم تھی۔ ہمیں کچھ یاد نہ رہا کہ گزشتہ رات کیا پڑھتے رہے اور اب کیا کہنا ہے۔ نتیجہ پورے پیریڈ کے دوران سوال گندم جواب چنا کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔

ہمارے پلاٹون کمانڈر تھے میجر غلام رسول۔ پنجاب رجمنٹ کے تیکھے افسر۔ کبھی ان کی بلوری سی آنکھیں مسکرانے لگتیں تو یوں لگتا شفقتوں کی اک گھٹا امڈ آئی ہے۔ لیکن وہی چہرہ کیڈٹ کی کسی غلطی پر جذبات سے عاری سپاٹ چہرے میں بدلتا تو اچھی بھلی ٹانگوں کے نٹ بولٹ ڈھیلے پڑ جاتے اور کیڈٹ کا خود کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔ پوری پلاٹون ان کے لیے کسی اچھے خوبصورت سے رشتے کی دعائیں کرتی رہتی اور وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ دن دیکھتے نہ رات، ہر وقت کیڈٹوں کے سروں پر منڈلاتے رہتے ـــــ صبح سویرے پی ٹی گراؤنڈ سے لے کر سورج چھپنے کے بعد مطالعے کے پیریڈ تک ان کی گھورتی آنکھیں ہمارا پیچھا کرتی رہتیں۔ دعاؤں کی قبولیت کی صورت میں اک موہوم سی امید تھی کہ ان کی نگاہیں بٹ جائیں گی۔ ہماری دعائیں قبول تو ہوئیں لیکن ذرا تاخیر سے جب ہم اکیڈمی چھوڑ چکے تھے اور میجر غلام رسول اپنے یونٹ کو سدھار چکے تھے۔

ہماری کمپنی کمانڈر تھے میجر سلیم۔ عام طور پر تقاریب کے انتظام و انصرام انھی کے ذمے ہوتے اور وہ کیڈٹوں کو یوں نصیحت کرتے نظر آتے جیسے دور دراز گاؤں کے کسی پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کچی جماعت کے بچوں کو شہر کی سیر پہ لے جانے سے پہلے ہدایات دے رہے ہوں، "دیکھو وہاں گاڑیاں چلتی ہیں بغیر کسی بیل گھوڑے کے۔ بچوں کو کچل دیتی ہیں، قطار نہیں توڑنی ہے۔ فٹ پاتھ پر چلنا ہے، فٹ پاتھ ہوتی ہے اک چیز، سڑک کے کنارے پیدل چلنے والوں کے لیے، سڑک ہوتی ہے ایک چیز جس پر چلتے ہیں ٹرک، ٹرک ہوتی ہے ایک چیز......"

ہمارے ہی ساتھیوں میں سے کچھ کے تھے پلاٹون کمانڈر میجر ارشد کوئی لمبی سی بیرل والی توپ آسمان کی طرف منہ اٹھائے کھڑی ہو تو جانے وہ کیوں یاد آ جاتے ہیں بے تحاشا بڑھتا ہوا لانبا سا قد، کھلتی ہوئی رنگت، ہر وقت کیڈٹوں کو تلاش کرتی بھوری بھوری آنکھیں اور حلق کے "مستعلیق" خانوں سے گرجتی، برستی، دھاڑتی ہوئی انگریزی، جیسے ۵۵ ملی میٹر کی کوئی توپ مسلسل (Rapid) فائر کر رہی ہو۔ خیر سے ستارۂ جرأت ہیں۔ انھیں ایک عجیب قسم کی بیماری ہے کہ مختلف انسانی اعضا کہ جن کے نام یہاں نہیں دیے جا سکتے ہر وقت ان کی آنکھوں کے سامنے ناچتے پھرتے رہتے۔ عام گفتگو ہو یا لیکچر، ڈرل سکیئر ہو یا پی ٹی گراؤنڈ، یہ اعضا۔ ان کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو پاتے اور جونہی وہ کسی کیڈٹ کو کوئی غلطی کرتا پاتے، انھی میں سے کوئی عضو اٹھا کر کیڈٹ کے سر پر پٹخ دیتے۔ کیڈٹ انھیں دیکھ کر دور سے راستہ بدل لیتے۔ آخری دنوں میں انھیں ایڈجوٹنٹ میجر سروش غنی کا معاون مقرر کر دیا گیا اور پاسنگ آؤٹ پریڈ کی تیاری کی نگرانی ان کی ذمہ داری قرار پائی۔ میجر سروش سپید براق ایسے گھوڑے پر بیٹھے اس کمپنی سے اس کمپنی اور اس سرے سے اس سرے تک دوڑتے پھرتے لیکن کیڈٹ قدم اٹھاتے تو سرپٹ لپکتے کہ قدموں کی آواز ملتی نہیں تھی ـــــ لیکن ادھر میجر ارشد ڈرل سکیئر کے سرے پر نمودار ہوتے اور ادھر جیسے ہر کیڈٹ کے قدموں اور بازوؤں میں کمپیوٹر فٹ ہو جاتا تب قدموں سے اٹھتی ہوئی ایک ساتھ گونج سن کر ایڈجوٹنٹ کے چہرے پر بشاشت کھل اٹھتی

ایک اور پلاٹون کمانڈر تھے میجر اکرام۔ جانے کہاں سے سڑکیں کاٹتے کاٹتے پی ایم اے پہنچ گئے اور کیڈٹوں کی تراش خراش پر مامور کر دیے گئے۔ خوش ہوتے تو یوں لگتا جیسے کسی منظور شدہ ماخذ[1] (Authorised Source) سے شفاف پانی کا خوبصورت جھرنا بہہ رہا ہو اور بگڑتے تو جیسے بہت ساری ٹینک شکن بارودی سرنگیں بہ یک وقت پھٹ پڑی ہوں۔ انگریزی پر عبور کرنا یا اسے امریکی لہجے میں بولنا ان کا مشغلہ تھا۔ انگریز کم بخت کے اپنے کچھ آداب ہیں۔ بولتا بھی ہے تو مقید بامحاورہ۔ بات بات میں معاف فرمائیے - (Exc-use me) کہنا ان کا شیوہ۔ اس کا جواب خاموشی ہوتا ہے۔ یا ایک مختصر سا ہنکارہ جس کا مطلب کہنے والے کو اپنی بات کہہ لینے کی اجازت ہو۔ لیکن میجر اکرام کے سامنے کوئی انتہائی انکساری کہتا "معاف فرمائیے" تو انھیں اس وقت تک چین نہ آتا جب تک وہ ایک شانِ سکندری سے یہ نہ کہہ لیتے "معاف فرمایا" (Excused) اور کیڈٹ بیچارہ جو جانے کہاں کہاں سے الفاظ اکٹھے کر کے بولنے کی ہمت کر پاتا، یہ غیر متوقع جواب سن کر ایک لمحے کو ششدر رہ جاتا۔

ایک اور تھے ہنستے مسکراتے من موہنے سے پلاٹون کمانڈر میجر رسالت کبوتروں کی ڈار میں سے تھے یعنی نام و پیام پہنچانا اور بکھرے ہوؤں کے درمیان ربط قائم رکھنا ان کی بنیادی ذمہ داری۔ پی ایم اے میں پلاٹون کمانڈروں کا کام خاصا کٹھن ہوتا ہے کہ کیڈٹ شہری زندگی کی آسائشیں چھوڑ کر آتے ہیں۔ انھیں جسمانی مشقتوں کی کٹھالی میں پگھلا کر تنومند سپاہیوں میں بدلنا اتنا آسان نہیں۔ کیڈٹوں کے ساتھ پلاٹون کمانڈروں کو بھی گرما کی دوپہریں آگ اگلتے سورج کے نیچے اور سرما کی راتیں تاریک قبرستانوں میں گزارنا ہوتی ہیں۔ ایسے میں مسکراہٹوں کو تابندگی اور حوصلوں کو دوام بخشنا بڑے لوگوں

---

[1] جنگ کی صورت میں علاوہ دوسرے کاموں کے، فوجی انجینئروں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ فوجیوں کے لیے پانی کے سرچشمے تلاش کریں۔ ڈاکٹروں اور انجینئروں کی طرف سے منظور کردہ پانی کے ماخذ کو منظور شدہ ماخذ کہتے ہیں۔

کا کام ہے اور رسالت انھی میں سے ایک تھے۔ ہنستی مسکراتی روشن آنکھیں، فراخ پیشانی پر بکھرے سیاہ بال، کشادہ چہرہ مسکراہٹ لیے ہوئے، پاکیزہ گفتگو، نرمی اور درشتگی کا حسین امتزاج۔

ایک بار کسی مشق کے دوران ایک کیڈٹ سے رائفل کا میگزین گم ہو گیا اور اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب ہم ساری رات چلنے کے بعد میلوں دور ایک اور مشق کے لیے ڈیرے ڈال چکے تھے۔ رجمنٹ کمانڈر میجر ظفر مصطفےٰ کو خبر ہوئی تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے اس پوری پلاٹون کا راشن پانی بند کر دیا جس سے کیڈٹ متعلق تھا اور لرزا دینے والی دھمکیوں کے دوران حکم دیا کہ میگزین ہر قیمت پر تلاش کیا جائے۔ میجر رسالت تلاش پارٹی کے انچارج مقرر ہوئے۔ واقعہ دھماکا خیز تھا، ہر طرف ایک دہشت، کیڈٹوں کی گھگھیاں اڑی ہوئی، لیکن رسالت پرسکون، پر اسی طریقے سے ایک درخت سے ٹیک لگائے بڑے اطمینان سے کیڈٹوں کو سمجھا رہے تھے کہ میگزین کیونکر تلاش کیا جائے۔

ہدایات دے کر انھوں نے ہمیں بسوں میں سوار کرا آگے بھیج دیا۔

چند میل تک ہم بسوں پر سوار رہے۔ پھر اتر کر چاروں طرف پھیل گئے۔ میجر زمین کو گھورتے اسی جگہ پہنچے جہاں پہلے مورچہ بند تھے۔ جاتے ہوئے خندقیں بھر گئے تھے، کسی نے کہا میگزین نیچے نہ رہ گیا ہو۔ مورچے کھودے جائیں۔ تجویز جان لیوا تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک مورچہ کھودنا شروع کیا اور زہے نصیب کہ پہلے ہی مورچے سے میگزین "برآمد" ہو گیا۔ کھوئی ہوئی چیز مل جانے پر ایسی خوشی پہلے کبھی ہوئی نہ ہوگی۔

جب سراسیمگی رخصت ہوئی اور سکون و اطمینان انگ انگ میں سما گیا تو دیکھا کہ ڈھلتے سورج کی کرنوں میں تپش باقی نہیں رہی۔ نرم نرم ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، سایہ دار درختوں کے پتے آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور قریبی تالاب پر سے گزر کر آتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خوشگوار احساسات کو مزید تقویت دے رہے ہیں۔ جانے کتنی راتوں کے جاگے ہوئے تھے، ایسے موقع تو اللہ دے اور بندہ لے۔ فیصلہ ہوا گھڑی دو گھڑی آرام کر لیں تو چلیں۔ ایک کیڈٹ کو سنتری کھڑا کیا اور باقی سب پاؤں پسار ایک دوسرے

کے پہلوؤں میں ڈھیر ہوگئے۔ ابھی غنودگی نے رنگ جمایا ہی تھا کہ سنتری کیڈٹ کی گھبرائی گھبرائی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ وہ کسی فوجی جیپ کی آمد کی خبر دے رہا تھا۔ نیند نے پلکوں میں اس قدر حلاوت گھول دی تھی کہ کھولے نہ کھلتی تھیں۔ نتیجتاً اٹھتے اٹھتے جیپ سر پر آن پہنچی اور اس میں سے برآمد ہوئے میجر رسالت۔

انھیں فوراً میگزین مل جانے کی خوشخبری سنا دی گئی۔ اس کے باوجود واپسی کی بجائے پڑ کر سو رہنا ایک جرم تھا۔ کوئی اور ہوتا تو گرج چمک کے ساتھ گالیاں پڑنے کا امکان بھی تھا لیکن انھوں نے مسکراہٹوں کے پھول بکھیر دیے۔ پتہ چلا ہمارے لیے ایک بڑے سے تھرموس میں گرم گرم چائے اور مزیدار کیک لے کر آئے ہیں۔ تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد وہ واپس ہوگئے۔ مزید ٹھہرنا بددیانتی نظر آئی۔ سو چائے کی چسکیاں لینے کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے۔ یہ سوچ سوچ کر ہول اٹھتی تھی کہ اتنے میل مارچ کے بعد رات کو پھر کہیں سنتری نہ بنا دیے جائیں۔ یا کسی گشتی دستے کے ساتھ نہ روانہ کر دیے جائیں لیکن کیمپ پہنچنے پر پتہ چلا کہ میجر رسالت نے تلاش پارٹی کی تمام ڈیوٹیاں معاف کروا رکھی ہیں۔

اف پی ایم کی وہ دنیا! جب زندگی نے سارا کشکول ہی کیڈٹوں پر انڈیل دیا تھا۔ یادوں کے دریچے سے میجر رسالت کا دمکتا چہرہ آج بھی ان کے حسن سلوک کی یاد دلاتا ہے تو روئیں روئیں سے تحسین کی صدائیں نکلتی ہیں۔

کیپٹن عزیز۔ انگلش کے انسٹرکٹر تھے۔ کھلتی ہوئی رنگت اور ہونٹوں پر کھیلتی ایک سدا بہار مسکراہٹ۔ سراپا شفقت، شفاف چہرہ، جس کی زبان آلودگیوں سے پاک تھی بولتے تو یوں لگتا۔

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم

باتیں کرتے تو یوں لگتا جیسے کانوں میں رس گھل رہا ہو۔ شیرینی بٹ رہی ہو۔ زبان پر مٹھاس کے ذائقے محسوس ہوتے۔ کیا سمارٹ سے افسر تھے۔ کیڈٹ کے روپ میں کتنے معصوم رہے ہوں گے۔ ہمیں اس ان دیکھے سینئر پر بہت غصہ آیا کرتا جو انھیں ایک [illegible] میں گرتی برف میں کھڑا کر کے بھول گیا تھا۔ وہ کم بخت خود تو لحاف میں میٹھی میٹھی نیند کے مزے لیتا رہا اور جونیئر کیڈٹ عزیز باہر برف میں ٹھٹھرتا رہا تا آنکہ کسی اور سینئر نے ان کی خلاصی کروائی

صوبیدار میجر عجائب خان

پی ایم اے میں ڈرل کے لیے مامور صوبیدار میجر اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتا ہے۔ ہر سال سینکڑوں کیڈٹ اس کے ہاتھوں افسروں میں بدلتے ہیں۔ ہر پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر لہلہاتے کیڈٹوں کی ایک فصل صوبیدار میجر ایڈجوٹنٹ کے حوالے کرکے کہتا ہے:

سیکنڈ پاکستان بٹالین حاضر ہے سر!

ہم نے جب بھی یہ الفاظ سنے، دل میں صوبیدار میجر کی عظمت کے نقوش گہرے ہوگئے۔ ان الفاظ میں اس کسان کی ساری جانفشانی شامل ہے جس نے جاڑوں کی راتوں اور جیٹھ کی دوپہروں کا خیال کیے بغیر فصلوں کی آبیاری کی ہو۔ ان میں دہقان کا وہ فخر و غرور بھی شامل ہے جو بھرے کھلیانوں کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر چمکتا ہے اور اس مزارع کا وہ سارا اعتماد و احترام اور عقیدت بھی جو وفاؤں کی لاج رکھنے پر مالک اور مزارع کے درمیان پیدا ہوتی ہے۔

ہماری بٹالین کے صوبیدار میجر تھے سگندر کے عجائب خان۔ ہر وقت کمان کی طرح تنے ہوئے، دبلا پتلا سا جسم اور نکلتا ہوا قد۔ کہر آلود صبحوں کے دھندلکوں میں ان کی آواز فضا کا سینہ چیرتی دور دور تک اس بات کا اعلان کرتی کہ ایس ایم عجائب خان پریڈ لے رہے ہیں اور جب وہ پریڈ ایڈجوٹنٹ کے حوالے کرتے تو برف کے سناٹوں میں [illegible] ان کی ترنم گونج سن کر ایبٹ آباد میں نیند کے متوالے کروٹیں بدلتے ہوئے کہتے: "سات بج گئے؟"

خدا جانے سچ ہے یا جھوٹ۔ سنا ہے ایک مرتبہ گرد و باراں کے طوفان سے ٹیلیفون خراب ہوگئے۔ پی ایم اے کے کمانڈنٹ نے جی ایچ کیو ضروری بات کرنا تھی۔ صوبیدار میجر عجائب خان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ڈرل سکوائر میں کھڑا کرکے پیغام ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور انھوں نے پنڈی کی طرف منہ کرکے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ جی ایچ کیو میں پیغام سو فیصدی درستگی کے ساتھ وصول ہوگیا۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کیڈٹ افسر بن جانے کے کچھ عرصہ بعد پی ایم اے میں پوسٹ

ہو جاتے ہیں۔ رینک کا تقاضا ہے صوبیدار میجر انھیں سلیوٹ تو کرتا ہے لیکن اس کے انداز سے استاد کا بڑا پن، شفقت اور کڑنگی رخصت نہیں ہو پاتی۔ ایک بار یوں ہوا کہ ایک صوبیدار میجر نے پریڈ ایڈجوٹنٹ کے حوالے کرنا تھی۔ یہ ایڈجوٹنٹ کیڈٹ کے روپ میں اسی ایس ایم کے ہاتھوں پاس آؤٹ ہوئے تھے۔ انھوں نے پوری بٹالین کو ترتیب سے فراز کیا، میجر ہوشیار (Attention) کیا اور ساکت رہنے کا حکم دے کر ایڈجوٹنٹ کی طرف گھوم گئے۔ سلیوٹ کیا۔ ایڈجوٹنٹ کے جوابی سلیوٹ میں وہ پھرتی اور چستی نہ تھی جس کا تقاضا ڈرل سکیٹر میں ہر کیڈٹ سے ہوتا آیا ہے۔

صوبیدار میجر کی گویا عمر بھر کی کمائی لٹ گئی، اس کی قیمتی متاع برباد ہو گئی، تاج محل مسمار ہو گیا یا جیسے کسی نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا ہو۔ اس کی نظروں سے ایڈجوٹنٹ کے شانوں پر چمکتا چاند ستارہ اوجھل ہو گیا اور میجر صاحب کیڈٹ میں بدل گئے۔ ایس ایم نے چلاتے ہوئے کہا "صاحب! یہ سکھایا تھا ہم نے آپ کو؟ یہ سلیوٹ لیا ہے آپ نے؟ غلط دوبارہ ہو گا۔" اور اس کے ساتھ ہی صوبیدار میجر اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا۔ بٹالین کو آسان باش (Stand at Ease) کروایا اور پریڈ حوالے کرنے کا سارا عمل دہرایا — یہ استاد کا مرتبہ تھا، عرق ریزی کا ناز تھا، جانفشانی کا غرور تھا۔ ایڈجوٹنٹ نے اس بار سلیوٹ لیا تو اس کے جسم میں بجلیوں کی سی پھرتی اور شعلوں کی سی لپک تھی۔

شاف رحمان

پنجاب رجمنٹ کا ایک لمبا تڑنگا نوجوان حوالدار جسے ہم شاف رحمان کہا کرتے، صبح سویرے ہم تیار ہوتے تو پیریڈ کی مناسبت سے لباس تو مختلف ہوتے، پی ٹی کٹ، ڈانگری یا پتلون قمیص لیکن پیروں پر ہمیشہ بڑے فوجی جوتے ڈانٹے پڑتے کہ منہ اندھیرے پیریڈ شروع ہونے سے بہت پہلے ہمیں خود کو شاف رحمان کے حوالے کرنا ہوتا تھا جس کے ذہن میں کیڈٹوں کا ڈرل کے علاوہ کسی اور حرکت میں مصروف رہنا تضیع اوقات تھا اور ڈرل کے لیے سب سے ضروری چیز بھاری بھرکم جوتے تھے جن کی چٹاخ پٹاخ آوازوں

کرنے بغیر شاف رحمان کے بقول آفتاب طلوع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

انھیں چند سیکنڈ بھی مل جاتے تو اس میں ڈرل کرائے بغیر نہ چھوڑتے۔ ہم کمپنی سے باہر نکلتے تو شاف رحمان ہمارا منتظر ہوتا، میس جاتے تو وہ ہمیں جلدی آنے کی تلقین کرتا، واپسی پر دیر سے آنے پر لال پیلا ہوتا اور تھم (Halt) کی مشق کرا کرا کے سارا ناشتہ یا کھانا چند منٹوں میں ہضم کروا دیتا۔ کلاس سے نکلتے تو وہ جلدی سے ہمیں فالن کر لیتا، کلاس کو جانا ہوتا تو وہ ڈرل کرواتے ہوئے لے کر جاتا۔ غرض شاف رحمان ہر وقت سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہتا۔

شاف قربان

ہوا اور ربڑ سے بنے ہوئے شاف قربان کو پی ٹی کٹ کے علاوہ کسی اور وردی میں دیکھا ہی نہیں گیا۔ پی ٹی کے تمام شاف والی بال کی طرح ہوتے ہیں ہلکے پھلکے، تیز، چست، چالاک۔ ہر وقت پی ٹی گراؤنڈ میں اڑتے پھرتے ہیں اور اپنے ساتھ کیڈٹوں کو بھی مائل پرواز رکھتے ہیں۔ شاف قربان کے نزدیک تو ویسے بھی پی ٹی پیریڈ میں کیڈٹ کا لمحے کے کسی عذر اور دم لینے کے لیے ساکت ہو جانا بھی جرم تھا۔ پورا پیریڈ وہ ہمیں کسی درخت کے دائیں طرف سے دوڑاتے، بائیں طرف سے واپس منگواتے، کبھی کئی بار دس دفعہ گھٹنے چھاتی سے لگواتے اور اس کے لیے ہمیں سینہ گھٹنوں کی طرف نہیں لے جانا ہوتا تھا، زمین کو چھوڑتے ہوئے اچھل اچھل کر گھٹنوں کو چھاتی سے لگانا ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں یوں لگتا جیسے بہت سے گھوڑے دولتیاں جھاڑ رہے ہوں۔ جب ہم بہت تھک جاتے اور وقفے کے لیے کہتے تو شاف قربان ہمیں اول دی ہینڈز ڈاؤن کروا دیتے۔ برف باری کے دنوں میں "آرام" کے لیے یہ لمحے خاصے طویل ہو جاتے۔ برف میں رکھے رکھے کیڈٹوں کے ہاتھ سُن ہو جاتے۔ سردی کے باوجود ان کی پیشانیاں عرق آلود ہو جاتیں۔ وہ پکارتے، "شاف، شاف، شاف قربان" لیکن شاف قربان کی خاموشیاں اس وقت ٹوٹتیں جب کیڈٹوں کے جسم ٹوٹ رہے ہوتے، سارا خون چہرے پر سمٹ آتا اور ہاتھ سن ہو کر رہ جاتے۔

یہ تھے ہمارے اساتذۂ کرام!



کیڈٹ سے پرے لگنے جنگلوں میں گھرے۔ کیڈٹ پکنک کے ایک موقع پر

دُکھوں کے ساجھی

کہتے ہیں ایک عدالت میں ایک شخص کے خلاف مقدمہ پیش ہوا۔ صاحبِ عدالت نے استغاثے کی طرف سے پیش ہونے والے گواہ پر جرح کرتے ہوئے پوچھا:

"کبھی تم نے اس شخص کے ساتھ سفر کیا؟"

"نہیں۔"

"کبھی اس کے پڑوس میں بسے؟"

"نہیں۔"

"کبھی اس سے کوئی معاملہ پیش آیا؟"

جواب پھر نفی میں تھا۔ عدالت نے اس شخص کے خلاف اس شخص کی گواہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک ایسی عدالت کا واقعہ ہے جس کی بصیرت کے قصوں سے فارس و شام کے ایوان لرزہ براندام تھے لیکن جس کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ ایک عام شخص برسرِ عام اس کے کرتے کی لمبائی پر نکتہ چینی کر سکتا تھا۔

ہم کسی عدالت کی کارروائی بیان کرنے چلے ہیں نہ کسی کے خلاف الزامات کی کوئی فہرست ہے جو ہمیں ثابت کرنا ہے۔ سیدھے سادے کیڈٹوں کا تعارف مقصود ہے کہ گرمی کی جھلستی دوپہروں میں جن کے ساتھ میلوں کی مسافت قدم بقدم ہنستے مسکراتے طے کی۔ سنسناتی سرد ہواؤں کی کتنی ہی ویران راتیں قبرستانوں کے سناٹوں میں پہلو بہ پہلو گزاریں اور کتنی ہی برساتوں میں دھنک کے خوبصورت رنگوں پہ مچلتی خواہشوں کا خون ہوتے دیکھا — افسانوی راتوں میں تصورِ جاناں میں کھونے کی بجائے جی سی آفس میں حاضری دی۔ پورے

پورے دن کی چیخ و پکار کے بعد قہقہوں کی محفلیں سجاتیں، تھکن سے چُور جسموں کے ساتھ ایک دُوسرے کا بوجھ اُٹھایا، کرب انگیز لمحات میں غم بانٹتے اور زخم کھا کھا کر مسکراتے رہے۔

زندگی کی راہوں پر جانے کتنے لوگوں سے مُلاقات ہوتی ہے۔ کچھ ہوتے ہیں کہ برسوں کی شناسائی کے بعد بھی بیگانے سے لگتے ہیں اور ــ

کتنے حسین لوگ تھے جو مِل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

قسم کی کیفیات سے بھی پالا پڑتا ہے۔ سکول کے ساتھی بھول سکتے ہیں لیکن دُکھوں کے ساتھی بھلائے نہیں بھولتے اور آج ہم انہی دوستوں کا احوال قلمبند کرنے چلے ہیں جو یادوں کی جھولی میں تازہ پھولوں کی طرح محفوظ ہیں اور وقت کی ظالم آندھی جن کے نقوش سرِ مو بھی نہیں مٹا سکی۔

جی سی لطیف

ہمارے ہاں دو لطیف تھے ایک تو اپنے نام کی طرح لطیف یعنی اسم با مسمّٰی۔ دُوسرے اس کے برعکس ________ ۔ یہ جو اسم بامسمّٰی لطیف تھے جسمانی طور پر خاصے کثیف تھے یعنی ایک میل کی دوڑ میں ہمیشہ دس کے دس نمبر لینا ان کا شیوہ، رسّے چڑھتے ہوئے ڈارون کی تھیوری سچ ثابت کرنا اکا سلاک، ۹ میل کی دوڑ میں مسلسل دوڑتے ہی چلے جانا ان کی عادت اور چھوٹے چھوٹے نالوں، کھالوں کو کسی چھلاوے کی طرح پھلانگ جانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ پی ایم اے والوں نے ان کی سخت جانی دیکھ (Paracourse) پیرا کورس پر بھجوا دیا یعنی نیلے گگن کے تلے، پیراشوٹ سے باندھ انہیں آکاش کی بلندیوں سے دھرتی کی گود میں پھینکا جانا تھا۔ سخت کوشی کا سخت امتحان۔ یار لوگ بتاتے ہیں جانے سچ ہے یا جھوٹ کہ وہاں انہیں ایک اور ہی مسئلے سے سابقہ پیش آیا۔ جہاز سے پھلانگ لگانے کے بعد پیراشوٹ انہیں کٹی پتنگ کی طرح اُڑائے لیے پھرتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ زمین پر آتے۔

دُوسری بار ان کے تلوؤں سے بھاری بھاری پتھر باندھے گئے کہ پُروا ہوائیں انہیں مجبوراً زمین کے حوالے کر آئیں۔

لطیف نمبر ۲

پی ایم اے سے بلاوا آیا تو ہماری پلاٹون میں سے لپک کر سب سے پہلے اکیڈمی پہنچنے والے وُہی تھے۔ اور اس ناطے وہ ہمارے پہلے ایس جی سی (S. G. C.) تھے یعنی سینئر جنٹلمین کیڈٹ۔

اسے آپ سکولوں کے مانیٹروں کی طرح کا ایک فوجی مانیٹر کہہ لیجیے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ایس جی سی کی ذمہ داریاں سُورج نکلنے سے پہلے شروع ہوتی ہیں اور رات ڈھلنے کے بعد تک جاری رہتی ہیں۔ مثلاً اندھیرے منہ پلاٹون کو تیار کر کے سٹاف کے حوالے کرنا، رات کو "سب اچھا" رپورٹ دینا، پلاٹون کمانڈروں کے احکامات وصول کر کے پلاٹون تک پہنچانا اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بننے کو تو سب ہی کیڈٹ ایس جی سی بنتے ہیں باری باری لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریاں آسان ہوتی چلی جاتی ہیں کہ ایک تو کیڈٹوں کو ایس جی سی کی اہمیت کا احساس ہوتا رہتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر ہونا چاہیں تو ایس جی سی کو باخبر رکھتے ہیں۔ دُوسرے سینئر ہونے کے بعد بہت سے ہرکارے جونیئر کیڈٹوں کی شکل میں بآسانی دستیاب ہوتے ہیں اور کوئی خبر کہیں سے منگوانی ہو یا کہیں پہنچانی ہو تو خاص مشکل پیش نہیں آتی لیکن جی سی لطیف نمبر ۲ پر تو سر منڈواتے ہی اولے پڑے یعنی اکیڈمی پہنچتے ہی ایس جی سی بنا دیے گئے۔ اب حالت یہ ہوتی کہ رات کو وہ اپنی پلاٹون کی او کے رپورٹ کسی سینئر کو دینے جا رہے ہیں۔ وہاں انہیں بہت سے سینئر اُچک لیتے کہ ذرا فلاں کمپنی تک یہ اطلاع دے آؤ فلاں پلاٹون سے یہ خبر تو لاؤ اور اس کے ساتھ ساتھ راستے میں سینئروں سے "مڈبھیڑ" بھی ہوتی رہتی۔ جب ہم خراٹے لے رہے ہوتے وہ برآمدے میں لڑکھڑا رہے ہوتے۔ پتہ چلا کہ لطیف او کے رپورٹ دے کر واپس آ گئے ہیں۔ لیکن آفرین ہے اس شخص

پر اس کے چہرے کی لطیف مسکراہٹ کو کوئی نہ چھین سکا۔

خان افضل

پاک باز و پاک صاف۔ نمازی پرہیزگار، سیدھا سادا کیڈٹ۔ پشتو بولتے تھے بڑی روانی کے ساتھ لیکن ان کی سب سے بڑی مشکل بھی یہی تھی کہ ان کی ساری فصاحت و بلاغت پشتو تک آکر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اُردو میں مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر سے بدلنا تو خیر ہمارے پٹھان بھائیوں کا عام شیوہ ہے لیکن وہ انگریزی کو بھی پشتو کے سانچے میں ڈھالتے تھے اور انگلش انسٹرکٹروں کے علاوہ پلاٹون کمانڈروں کے غیض و غضب کو بھی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ٹرننگ میں آتے تو ہمیں یہ گیت سنایا کرتے۔

لاڑشا پیخاور تا قمیص تور مالا را وڑہ

تازہ تازہ گلونہ درے سلور مالا را وڑہ

(ذرا پشاور تک جانا اور میرے لیے ایک کالی قمیص اور تین چار تازہ پھول لیتے آنا)۔

اور پھر تو یہ گیت ہر محفل کے لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا۔

شیر افضل

پاسنگ آؤٹ کے بعد اے کے رجمنٹ کے حصے میں آئے ہیں۔ یہ چوڑے چکلے شانے، نکلتا ہوا قد، بلوری آنکھیں اور نقرئی گھنٹیوں کی سی آواز میں بولتے، یہ تھے ہمارے شیر افضل۔ کڑی دھوپ کے سیلن سفر نے انہیں مغموم کیا نہ برف کی سلوں پر کڑی مشقتیں ان کی مسکراہٹیں چھین سکیں۔ غالباً یہی خوبی انہیں ہمارا بٹالین کوارٹر ماسٹر بنا گئی۔

منور

بلا کی ذہین چیز جنھوں نے ثابت کر دکھایا کہ رنگ سانولا ہونے کے باوجود

انسان لگن سے کام کرے تو کوئی اسے اس کے صحیح مقام سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ شروع شروع میں پی ایم اے کی مشقتیں ان پر عذاب بن کر نازل ہوئیں کہ کبھی ان کی ٹانگ سلامت نہ رہتی تو کبھی دیکھتے ہمارے ان کا پیچھا کیا ہوتا۔ کبھی ان کا معدہ قابو سے باہر ہوتا تو کبھی ٹخنے اکڑے رہتے۔ کبھی ٹانگ سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوتیں۔ لیکن پھر وہی منور تھا کہ پی ٹی گراؤنڈ میں اسے رہنے کا آدمی کہتے اور کلاس روم میں سنڈیکیٹ لیڈر۔ کمپنی کے سینئر انڈر آفیسر ہونے کا شرف انہیں ہی حاصل ہوا۔

ظفر سلیم

چھوٹی توپ کی کسی بیرل کی طرح دبلے پتلے ہنستے مسکراتے سلیم کو توپخانے والوں نے اُچک لیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت یوں گھورتی نظر آتیں جیسے کوئی افسر توپچی اپنے لیے ٹارگٹ تلاش کر رہا ہو۔ شروع شروع میں ان کی ٹانگوں نے بھی تعاون سے انکار کر دیا۔ زخموں سے ہلکان ہوتے جاتے۔ ان کے بال جاتے تو یوں لگتا جیسے کمرہ آئیوڈیکس بنانے والوں کے تعاون سے تعمیر کیا گیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آئیوڈین کی جھنکاروں کی جگہ لیڈی کلوں کی مہکاروں نے لے لی اور درد سے کراہتا ظفر ہنستے مسکراتے شہزادے سلیم میں بدل گیا۔

ہمایوں

ہنستے مسکراتے ہمایوں کسی مغل تاجدار کی نشانی تو نہیں تھے البتہ اپنے ڈیل ڈول سے کسی پہلوان گھر کے چشم و چراغ ضرور دکھائی پڑتے تھے۔ جسم کی وجہ سے پی ٹی پیریڈ خاصا شاق گزرتا تھا۔ اور وزن ٹال والا دن تو قیامت سے کم نہ ہوتا۔ وزن ٹال میں بار بار فیل ہونے کے بہت بعد کی بات ہے کہ ایک دن میس میں بیٹھے ہوئے انھوں نے انکشاف کیا کہ وہ پی ٹی میں پہلے سے بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ ہم نے حیرانگی کے عالم میں ان کے اس بیان کی وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا "پہلے جب میں وزن ٹال ختم

کرکے واپس آتا تھا تو سٹارٹنگ پوائنٹ پر کوئی بھی شخص موجود نہ ہوتا تھا۔ سب جا چکے ہوتے تھے لیکن اب واپس آتا ہوں تو کچھ لوگ جھنڈے وغیرہ سمیٹ رہے ہوتے ہیں۔" افسوس کہ ایک سانحے کی وجہ سے انھیں پی ایم اے کو خیرباد کہنا پڑا۔

اقبال عابد

بہت ہی باصبر قسم کی چیز تھے۔ فوجی مشقوں کے دوران اکثر اس حالت میں پائے جاتے کہ ایل ایم جی اٹھائے ہوئے ہیں، چہرے سے پسینے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ حیران حیران نظروں سے اپنے مددگار ایل ایم جی نمبر ۲ کو تلاش کرتے ہیں لیکن وہ ایسے غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پیچھے سے پلاٹون کمانڈر چیخ رہے ہیں، "تمھارے قدم لڑکھڑاتے کیوں جاتے ہیں؟" بیچارہ عابد۔ کس سے کہے، کس سے کہے؟

ایک بار میپ ریڈنگ کی ایک ایکسرسائز میں پلاٹون کمانڈر نے کسی کام سے بلایا۔ ہاتھ میں رنگ برنگی پنسلیں تھامے وہ درختوں کی اوٹ سے برآمد ہوتے تو فوراً ہی پلاٹون کمانڈر سے سامنا ہو گیا۔ گھبرا کر انھوں نے ایڑیاں بجائیں اور پنسلوں والے ہاتھ ہی سے سلیوٹ داغ دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، تفصیلی کہانی ہے۔ روایت سننے میں آئی ہے کہ آج بھی کسی سینئر کو سلیوٹ کرتے ہیں تو دائیں ہاتھ کو یوں جھٹکا دیتے ہیں جیسے کوئی چیز گرا رہے ہوں۔

پرویز اقبال

پلاٹون کے قابلِ احترام دانشوروں میں سے ایک تھے۔ جسم تو ان کا بھی کچھ کم نہ تھا لیکن پی ٹی کے پیریڈ میں نشستم پشتم دوسرے کیڈٹوں کے ساتھ ملے رہتے تھے۔ رات کے دس بجے کے بعد جب اکیڈمی میں لائٹ آن رکھنا جرم ہے وہ روشنیاں گل کرکے سگریٹ کی لو میں یاروں دوستوں کے ساتھ فکر کی نئی شمعیں جلاتے۔ دکھ درد،

کھا پا سکتے، کچھ اور دل سے کھیلتے۔ ایک بار رات گئے جاگتے ہوئے پکڑے جانے کی پاداش میں کتنے ہی دن غمگین رہے۔

جی سی جہانگیر

ویسے تو ہم سب ہی جی سی تھے لیکن جانے ان کا نام جی سی جہانگیر کیوں کر پڑ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ جی سی کی ڈگر سے ہٹ جانے کا تصور بھی ان کے ہاں نہ پایا جاتا تھا۔ ڈاجنگ انھیں کبھی چھو کر نہ گزری تھی۔ پابندیِ اوقات کے کھاتے میں پوری پلاٹون کا درد ان کے جگر میں تھا اور اس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ تھا کہ شام چار بجے پلاٹون کمانڈر نے کہیں بلایا ہے تو اس کی تیاری صبح چار بجے شروع کی جاتے۔ گھنٹوں پہلے وہ تیار ہو کر پریشانیوں کے عالم میں ایک کمرے میں جاتے تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے کہ "ہیں! صرف تین گھنٹے باقی ہیں اور تم نے ابھی تک لباس بھی نہیں بدلا!" گھبرا کر کسی دوسرے کیڈٹ کی خبر لینے جاتے تو ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا کہ کمرے کا مکین انھیں بے سُدھ سویا پڑا ملتا۔

ضامن نقوی

صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ نظر ضرورت سے زیادہ تیز تھی جسے کنٹرول میں رکھنے کے لیے عینک لگاتے تھے۔ روڈ واک رَن (Road Walk - & Run) کے دوران اکثر سڑک کنارے کسی آنگن میں لہراتے دوپٹے سے جا الجھتی تھیں، جنھیں بڑی مشکلوں سے یہ یقین دلانے کے بعد چھڑایا جاتا تھا کہ یہ کوئی عام سا کپڑا تار پر پڑا سوکھتا ہے کسی حسین چہرے کا ہالہ نہیں کیے ہوئے۔

پی ٹی اور ڈرل کی مشقوں کے دوران کھونے والی قوت کو بروقت بحال کرنے کے زبردست مدعی تھے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ایک مرتبہ پی ٹی سٹاف نے ان کے جبڑوں کو غیر ضروری حرکت کرتے دیکھ لیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ موصوف عین پی ٹی پیریڈ کے دوران

ہوا بر دوش

صاحبو! یہ کتاب تکمیل کے آخری مراحل میں تھی اور ہم ان دوستوں کی تلاش میں تھے جو کتاب کی اشاعت کے لیے باقاعدہ اصرار کریں اور جن کی ضد کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم اسے شائع کر ڈالیں کہ ایک عجیب سانحہ رُونما ہوا۔ ہم اچھے بھلے کپتان بنے بڑے کرّوفر سے دن گزار رہے تھے کہ ہمارے شانوں کے تینوں پھول یکایک غائب ہو گئے اور ہم نے خود کو کپتانوں کی صف سے نکل کر ایک بار پھر کیڈٹ کا سا رُوپ دھارے دیکھا۔ فوج میں میجر سے کپتان یا کپتان سے لفٹین ہو جانا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس پر واویلا کیا جائے یا باقاعدہ لکھنے لکھانے کا اہتمام ہو کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ فوج میں ڈسپلن کے اپنے کچھ تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تھی نہ کسی کی شان میں گستاخی پھر بھی کپتانی چھوڑ کے عام جوان بنے پھرتے تھے۔

کپتان سے براہِ راست کیڈٹ بن جانے کی یہ روداد خاصی دلچسپ ہے۔ اس حادثے سے ہم اکیلے ہی متاثر نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمارے ساتھ ایک انفنٹری یونٹ کے اچھے بھلے کرنیل کہ یونٹ میں ہوں تو جن کی رضا کے بغیر پتّہ نہ ہلنے پائے۔ کرنیلی چھوڑ ہمارے ساتھ عام جوانوں کی صف میں شامل تھے۔ میجروں اور کپتانوں کا تو خیر شمار ہی کچھ نہ تھا۔ لفٹین بھی اچھی بھلی تعداد میں تھے اور کچھ تھے ہمارے سمندروں کے محافظ جو اپنی برف ایسی سپید وردیوں کو چھوڑ ہمارے ساتھ مٹی میں رُلتے تھے۔

اس حادثے کے کرتا دھرتا ہیں پیراشوٹ ٹریننگ ونگ (P.T.W) والے کہ پیراشوٹ کی مدد سے اُڑتے جہازوں سے چھلانگ لگانے کی تربیت دینا ان کے ذمّے ہے۔

اس تربیت کو کامیابی سے مکمل کرنے والے اپنی وردی پر سینے کے دائیں جانب ایک خوبصورت سے "ونگ" (Wing) کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ دو جانب پھیلے ہوئے خوبصورت پروں پر مشتمل ہوتا ہے جس کے درمیان میں پیراشوٹ کی کشیدہ کاری ہوئی ہوتی ہے۔ بس ایسا ہی کوئی ونگ کبھی ہمیں بھی سجا گیا ہوگا۔ دل کے کسی کونے سے اسے پالینے کی خواہش ابھری اور مچلتے مچلتے اس خواہش نے بے تاب تمنا کا رُوپ دھار لیا۔ شاید ہماری اس خواہش میں اس حسرت کو بھی دخل حاصل رہا ہو جو آزاد فضاؤں میں تیرنے سے متعلق ہر انسان کے سینے میں ہمیشہ سے دفن رہی ہے۔

سکول پہنچنے کی جدوجہد میں ہمیں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا یہ ایک لمبی اور الجھی ہوئی کہانی ہے اور اچھے لوگوں کا کہنا ہے کہ الجھنوں کو عام کرنا مناسب نہیں۔ سو آپ کو رُوداد سناتے ہیں سکول پہنچنے کے بعد کی۔ لیکن پہلے ذرا سکول میں رائج مختلف اصطلاحوں کو سمجھ لیجیے کہ ان کو جانے بغیر آپ اس رُوداد سے لطف اندوز نہ ہو سکیں گے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سکول کی ساری سرگرمیاں انہی اصطلاحوں کے گرد گھومتی ہیں۔

سٹاف

ہمارے علم کی حد تک انگریزی زبان کے اس لفظ کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کسی محکمے کے عملے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور دوسرے ڈنڈے کو بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہم جہاں تک سمجھ سکے ہیں سکول میں لفظ سٹاف بیک وقت ان دونوں معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پہلے معنوں میں سٹاف انسٹرکٹرز طلبہ کو مختلف مشقوں کی تربیت دیتے ہیں اور دوسرے معنوں میں ہر وقت طلبہ کے پیچھے لپکتے پھرتے ہیں۔ جہاں موقع ملے ان پر برستے ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں انہیں زمین پر لٹا دیتے ہیں۔ اور حکم دیتے ہیں۔ "گیٹ ٹن"۔ اس کا مفہوم آئندہ کے صفحات میں ملے گا۔

تم کون؟ ہوا بردوش!

ہوائی جہاز سے فضاؤں میں تیرنے کی باری تو کورس کے آخری دنوں میں آتی ہے اور اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے کچھ لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا، سکول سے رُخصت کر دیے جاتے ہیں لیکن تمام طلبہ پر پہلے دن سے لازم کر دیا جاتا ہے کہ جب کبھی ان سے پُوچھا جائے کہ تم کون؟ تو پھیپھڑوں کی تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے انہیں چلانا ہوگا۔ "ہوا بردوش" ابتدائی دنوں کی چلچلاتی دھوپ میں مختلف مشقیں کرتے ہوئے جب پیاس کے مارے زبان سوکھ جاتی تھی، اور یہ نعرہ لگا لگا کر حلق بیٹھ جاتا تھا تو ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ نعرہ دن میں تارے نظر آنے والے محاورے کا منہ بولا بھائی ہے۔ جب دن کے اجالوں میں کسی کو تارے دکھائے جا سکتے ہیں تو زمین پر رکھتے ہوئے بھی ایک شخص کو فضاؤں میں اڑایا جا سکتا ہے۔ سکول میں جو شدید قوت و حوصلہ طلب مشقیں کرائی جاتی ہیں اور جس انداز میں ہوتے ہیں جو کسی شیر سے بھی گراں تبدیلی کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد طلبہ بظاہر تو زمین ہی پر دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقتاً دُور کہیں فضاؤں میں گم ہوتے ہیں۔

ہارنس

زین نما یہ ساز و سامان، نائلون اور سوت کے انتہائی مضبوط دھاگوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ ابتدائی دنوں ہی سے اسے طلبہ پر کس دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کے عادی ہو جائیں۔ جہاز سے چھلانگ لگانے پر جمپر (Jumper) اسی ہارنس کی مدد سے پیراشوٹ سے منسلک رہتا ہے۔ اس کے سٹریپ یا پٹیاں بازوؤں اور ٹانگوں کے اوپر نیچے اور درمیان سے گزرتی ہوئی سینے پر آ کر ملتی ہیں اور خالص فولاد کے بنے ہوئے ایک تالے میں پھنسا دی جاتی ہیں جسے آسانی سے کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔ اس کو پہن لینے کے بعد کوئی شخص اپنی عام انسانی چال برقرار نہیں رکھ سکتا کہ کچھ پٹیاں گردن نیچے کی طرف کھینچتی ہیں تو کچھ اور انسان کو اپنی ٹانگیں ہوا میں اٹھا لینے پر آمادہ کرتی رہتی ہیں۔ کمر پر لدا پیراشوٹ آپ کو جھکائے رکھتا ہے جبکہ

پیٹ پر بندھا ایمرجنسی پیراشوٹ آپ کو سیدھا کھڑا رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔

ہارنس کو مسلسل پہنے رہنے پر اپنی صنف کے بارے میں خواہ مخواہ ایک شک سا گزرنے لگتا ہے اس کی ایک وجہ تو بیٹنے پر دائیں اور بائیں جانب لگی دو پٹیاں ہیں جنھیں خالص نسوانی انداز میں بڑی آہستگی اور ملائمت سے کھینچ کر درست کیا جاتا ہے۔ آہستگی سے اس لیے کہ دونوں پٹیوں کو برابر رکھنا ہوتا ہے اور ملائمت سے اس لیے کہ یہ پٹیاں اگر ضرورت سے زیادہ کھینچ دی جائیں تو انسان کی گردن نیچے کی جانب جھک آتی ہے اور پھر جب تک تمام پٹیاں کھول نہ جائیں گردن اپنے مقام پر واپس نہیں جا سکتی۔ دوسری وجہ پیٹ پر "اُبھرا" ایمرجنسی پیراشوٹ ہے جو نہ صرف یہ کہ چلتے ہوئے باقاعدہ اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے بلکہ اگر ٹھیک طرح فٹ نہ کیا گیا ہو تو اُٹھتے بیٹھتے پورے جسم کے لیے درد کا سامان پیدا کر دیتا ہے اور اس حالت میں گرفتار شخص اپنے چہرے پر شدید درد کی کیفیت لیے اسے ہاتھ سے سہارا دیے رکھتا ہے۔ کچھ لوگ کہ جن سے خود اپنا جسم سنبھالے نہیں سنبھلتا، اس "مشقت" کو برداشت کرتے ہوئے باقاعدہ مہینوں کا حساب کتاب کرتے پائے گئے۔

ماک ڈور Mock Door

لفظ "ماک" کے بھی انگریزی میں دو معنی ہیں۔ ایک تو جھوٹے اور نقل کے دوسرے ہنسی اڑانے اور تمسخر کے۔ ہمارے نزدیک سکول کے "ماک ڈور" دونوں معنوں پر پورے اُترتے ہیں۔ پہلے معنوں میں یہ دروازہ جہاز کے اس حصے سے مشابہ ہے جہاں سے چھلانگ لگائی جاتی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ جہاز میں دروازے کسی کنجوس کی مٹھی کی طرح بند رہتے ہیں اور صرف ضرورت کے وقت کھلتے ہیں لیکن یہ دروازہ کسی شب بیدار عاشق کے دل کی طرح ہر وقت کھلا رہتا ہے اور طلبہ کو بار بار اس میں سے چھلانگیں لگا کر مشق کرائی جاتی ہے۔ دوسرے معنوں کا منظر وہ حلیہ اور وہ انداز ہے جس میں طلبا کھلا

سم سم" قسم کا ایک ورد کرتے ہوئے اس دروازے سے گزرتے ہیں۔ اس ورد کا مخاطب دروازہ نہیں بلکہ وُہ پیراشوٹ ہوتا ہے جسے جمپر اپنی پشت پر اٹھائے ہوتے ہیں۔

پی ایل ایف

یہ "پیرالینڈنگ فال" کا مخفف ہے۔ فضاؤں کو عبور کر کے جب کوئی جمپر زمین کے قریب پہنچتا ہے تو پکے آم کی طرح دھپ سے زمین پر نہیں آ رہتا بلکہ ایک خاص انداز میں زمین پر اُترتا ہے۔ اس خاص انداز ہی کو پی ایل ایف کہتے ہیں۔ اسی فال کا اعجاز ہے کہ جمپر زمین پر آنے کے چند لمحوں بعد ہی لوٹ پوٹ کر پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ پیراشوٹ لپیٹ کر ایک تھیلے میں ڈالتا ہے اور اپنی راہ لیتا ہے۔ اگر فال کا صحیح طریقہ نہ اپنایا جائے تو وہ رفتار جس سے پیراشوٹ زمین کی طرف آتا ہے "بازو" ، "ٹانگ" یا سر وغیرہ توڑنے کے لیے کافی سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اگر ہوا شدت سے چل رہی ہو تو اچھے بھلے تجربہ کار لوگ بھی چکرائے چکرائے سے زمین پر نازل ہوتے ہیں اور پی ایل ایف کے تمام بھولے ہوئے سبق خود بخود یاد آ جاتے ہیں۔

گیٹ ٹین

اس کا اُردو ترجمہ تو "دس لو" ہی ہے۔ لیکن عملاً جب یہ الفاظ کسی سٹاف کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ حکم ہے کہ دس بیٹھکیں یا دس ڈنٹر نکالو لفظ "یا" ذرا تشریح طلب ہے۔ جب کسی سٹاف کی طرف سے یہ پکار سنائی دے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سٹاف طلبہ سے ان کی منشا دریافت کر رہا ہے کہ وہ ڈنٹر نکالیں گے یا بیٹھک۔

طلبہ کو ڈنڈ اور بیٹھکیں دونوں یکساں طور پر پر ہول دکھائی دیتی ہیں کہ ایک سے شانوں کی جان نکلتی ہے اور دوسری رانوں پر گراں گزرتی ہے۔ ایک سے ہاتھوں کے رگ پٹھے کھنچتے ہیں تو دوسری سے پنڈلیوں کی رگیں پھولنے لگتی ہیں۔ ایک سے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی ہیں تو دوسری سے ٹانگوں کی ہڈیاں چٹختی ہیں اس لیے اگر طلبہ سے یہ پوچھا جائے کہ وہ

ڈنٹر یا اُٹھک بیٹھکیں میں سے اس حرکت کی برکت میں اضافہ کرنا پسند فرمائیں گے تو وہ کسی ایک میں بھی "ملوث" ہونا پسند نہ کریں لیکن یہ حکم ہے کہ عام حالت میں گیٹ مین کا مطلب دس ڈنٹر نکالنا ہے اور اگر ہارنس پہنا ہوا ہو تو دس بار "اُٹھ بیٹھ" کرنا ہے (ہارنس پہن کر ڈنٹر پر پشت اچھا ہی نہیں کی جا سکتی۔ پیٹ بڑھا ہوتا ہے نا!) یہ بیٹھکیں انگریزی میں لگائی ہوتی ہیں اور سکول میں انہیں "نی بینڈرز" (Knee Benders) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انگریزی بیٹھکیں اپنی دیسی بیٹھکوں سے اس لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں کہ دیسی بیٹھکوں میں تو بازوؤں کو سمیٹ کر اٹھنے بیٹھنے میں ان سے مدد لی جاتی ہے لیکن انگریزی بیٹھکوں میں بازو پھیلا کر سینے کے سامنے کر لیے جاتے ہیں اور اسی حالت میں بیٹھ کر اٹھنا ہوتا ہے۔

گیٹ مین کا یہ حکم صرف شاقوں ہی کی طرف سے نہیں ملتا بلکہ سکول والوں نے جگہ جگہ سفید رنگ کے بورڈ لگا رکھے ہیں جن پر سرخ رنگ میں لکھا ہوا ہے گیٹ مین، طلبہ کو ہدایت ہے کہ ایسے کسی بھی بورڈ پر نظر پڑتے ہی وہ فوراً زمین بوس ہو جائیں اور دس ڈنٹر نکالیں۔ اس قسم کا ایک بورڈ سکول کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی لگا ہوا ہے اور صورت یہ ہوتی ہے کہ سکول میں داخل ہوتے ہی طلبہ کا پالا اس بورڈ سے پڑ جاتا ہے اور وہ بجا پُرجوش کا نعرہ لگاتے ہوئے زمین بردوش ہو جاتے ہیں اور بلند آواز میں چیخ و پکار شروع کر دیتے ہیں۔ ایک...... دو...... تین...... چار...... عام شہری جن میں طلبہ و طالبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ دیر تک صدر دروازے پر رک کر ان فوجی طلبہ کے اپنے تعلیمی ادارے میں داخلے کا پرجوش منظر دیکھتے رہتے ہیں اور جب خود اپنے اداروں سے کافی لیٹ ہو جاتے ہیں تو مسکراتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ بورڈ آویزاں کرنے کی وجہ تسمیہ ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے کہ سکول والے دل کی گہرائیوں سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ تمام طلبہ ہر وقت اُٹھ بیٹھ ہی کرتے رہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر جگہ شاقوں کو تو متعین نہیں کیا جا سکتا کہ سکول میں پہلے ہی عملے کی خاصی کمی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ شاقوں کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ بورڈ آویزاں کر دیے گئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آسائشی علاقے Rest Areas

تربیت گاہ (Training Areas) کی دونوں جانب آسائشی علاقے واقع ہیں۔ ریسٹ ایریا کے نام سے پکارے جانے والے ان علاقوں کی حیثیت بحر ظلمات میں پرسکون جزیروں کی سی ہے (ظلمات کو ظلم کی جمع کے معنوں میں پڑھا جائے) اردو میں اس کا صحیح ترجمہ آرام والے علاقے ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں آرام کے جو مناظر دیکھنے میں آتے ہیں ان کے مد نظر آسائشی علاقے ہی ٹھیک ترجمہ ہے کہ یہاں آرام کے ساتھ ساتھ سہولت بھی ہوتی ہے اور اس کی دُھنوں پر ناچتے گاتے طلبا بھی۔ وہ ایک گھنٹہ جو شاف کے زیر سایہ پی ایل ایف بناتے گزرتا ہے یا معلق ہارنس پہنے خدا خدا کر کے گزارا جاتا ہے طلبہ کو ادھ موا کر دیتا ہے۔ جب بازوؤں میں جان نہیں رہتی اور ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیتی ہیں آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں تو حوالدار میجر کی خوش کن سیٹی سنائی دیتی ہے۔ تمام کام ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے اور دوسری سیٹی بجتے ہی یوں لگتا ہے جیسے طلبہ میں ایک نئی رُوح پھونک دی گئی ہو۔ ہر کوئی پوری قوت سے آسائشی علاقوں کی جائے پناہ کی طرف دوڑتا ہے کہ جہاں کھڑے ہونے کا کوئی انداز مقرر ہے نا بیٹھنے کی کوئی ترتیب۔ کسی کو لیٹنے پر کوئی اعتراض ہے نا سونے پر کسی کی افسری اس کے آڑے نہیں آتی۔ کوئی اسٹیل ہیلمٹ کو سر کے نیچے رکھ کر زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ کوئی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیتا ہے۔ کوئی زمین پر لیٹ کر ٹانگیں بنچ پر رکھ چھوڑتا ہے کہ شاید خون کی گردش ٹانگوں سے کم ہو کر سر کی طرف بڑھ جائے تو تھکن کم ہو۔ بہت سے لوگ پانی کے مٹکوں پر جھپٹتے ہیں جن کے دائیں بائیں نمک کی ڈلیاں یوں رکھی ہوتی ہیں جیسے گائے بھینسوں کی کھرلی میں نمک کے ڈلے۔ مختلف مشقوں میں طلبہ کا بالٹیوں پسینہ بہہ جاتا ہے جو جسم کے نمکیات اپنے ساتھ ہی لے جاتا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کا یہ اہتمام ہے۔ طلبہ مگوں میں پانی نکالتے ہیں۔ نمک کی ڈلیاں ان میں گھولتے ہیں اور غٹاغٹ مگ خالی کر کے کسی اور کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔

آسائشی علاقے کے ایک کونے میں کینٹین نام کی ایک چیز بھی ہے جو صرف طلبہ کے

آنے پر لگتی ہے اور ان کے جانے پر دل ویران کی طرح سنسان ہو جاتی ہے۔ یہاں ٹھنڈے مشروبات میسر ہیں۔ ایک گرم مشروب بھی ملتا ہے جس کی رنگت مٹیالی مٹیالی اور ذائقہ تمباکو اور گڑ کے محلول سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں کے باسی اسے چائے کے نام سے پکارتے ہیں۔

جوں ہی طلبہ تھکے ہارے یہاں پہنچتے ہیں، پس منظر سے موسیقی کی دھنیں بکھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ شروع شروع میں تو لوگوں کے انگ انگ سے درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں اور

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

کا سا سماں ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب ڈھیلے جسم کس چکتے ہیں، فالتو چربی پگھل جاتی ہے اور درد سے کراہتے مریضوں کا ہجوم ہنستے گاتے ساتھیوں میں بدل جاتا ہے تو موسیقی کی دھنوں پر پیر تھرکتے ہیں۔ گیتوں کے مصرعوں پر نعرے بلند ہوتے ہیں۔ نیند آنکھوں سے پھلجھڑی بن کر جھڑ جاتی ہے اور تمام تھکن دور ہو جاتی ہے۔

آرام کا وقفہ ختم ہونے کی پہلی سیٹی سنائی دیتی ہے تو کوئی حوالدار میجر کی گاڑی کسی ٹرک کے نیچے رکھنے کا مشورہ دیتا ہے کہ اس کی تیز رفتاری کا یہی علاج ممکن نظر آتا ہے۔ کوئی چائے کے ادھورے کپ کو سٹراپ حلق کے نیچے اتار دیتا ہے۔ دوسری سیٹی ہوتے ہی سب لوگ ہوا بردوش کا نعرہ لگاتے ہوئے پھر تربیتی میدان کی طرف لپکتے ہیں جہاں پہلے سے منتظر سٹاف ان کا استقبال "گیٹ مین" کے نعروں سے کرتے ہیں۔

سٹیل ہیلمٹ Steel Helmet

کچھ لوگوں نے اسے "عقل چوس ٹوپ" کے نام سے پکارا ہے جبکہ میجر اور لوگوں کی رائے میں اس کا نام "بال صفا ٹوپی" ہونا چاہیے۔ اسے پہننے کے بعد عقل انسانی جس طرح آبی بخارات کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتی ہے یا سر کے بال جھڑنے کا عمل جس تیزی سے شدت اختیار کرتا ہے اسے دیکھتے ہوئے ان دونوں ناموں میں کسی اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ سٹیل ہیلمٹ اکثر باقی فوج میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پی ایم اے میں بھی مختلف مشقوں کے دوران اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ امتیاز صرف پیرا ٹروپنگ ونگ کو حاصل ہے کہ

یہاں کے طلبا صبح سے شام تک اسے اپنے سروں پر سجائے رکھتے ہیں۔ موسم سرما میں اس کے پہننے سے شاید کوئی پریشانی نہ ہوتی ہو لیکن تپتی دھوپ کی بھری دوپہر میں جب اس سمیت تربیتی میدان کا بار بار طواف کرنا پڑتا ہے۔ یا طلبہ کو پی ایل ایف کی مشق دیتے ہوئے مختلف بلندیوں سے گرایا جاتا ہے تو پسینے اور خاک دھول کی تہیں سر پر جمتی چلی جاتی ہیں۔ ہوا چل رہی ہو تو باقی جسم کا پسینہ تو سوکھتا رہتا ہے لیکن اس کنٹوپ میں ہوا کا داخلہ سختی سے منع ہے۔ نتیجتاً پہلے تو بال چپ چپانے لگتے ہیں اور پھر ہیلمٹ کی رگڑ سے اکھڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس ہیلمٹ کے آگے اور پیچھے وہ نمبر لکھا ہوتا ہے جو ہر طالب علم کو اس کی سینیارٹی کے لحاظ سے ملتا ہے۔ طالب علم کو اس کے نام سے نہیں بلکہ اسی نمبر سے پکارا جاتا ہے اور سٹاف کو طلبہ کے نام یاد ہوں نہ ہوں، یہ نمبر ضرور ازبر ہو جاتے ہیں۔ میلوں دور بھی کوئی طالب علم کوئی غلط حرکت کرے تو سٹاف ہیلمٹ کا یہ نمبر جھٹ پڑھ لیتا ہے اور وہیں سے چلاتا ہے "ڈبل فائیو۔ ڈبل فائیو یہ کیا ہو رہا ہے۔ ویک پی ٹی پر آئیں گے آج شام کو آپ۔"

چھوٹے چھاتے گرنے کی تربیت

ارغوانی رنگ کی شراب پی کر جو لڑکھڑاتے ہیں وہ گرنے کو کب خاطر میں لاتے ہیں کہ گرنا تو ان کا مقدر ٹھہرا لیکن وہ لوگ کہ سیکڑوں ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر اڑتے ہیں۔ زمین پر آتے ہوئے ایک لمحے کو بھی مدہوشی کا مظاہرہ کریں تو تباہی ان کا مقدر بن جائے۔ ہڈیاں ٹوٹیں، پٹھے چڑھیں، سانسیں اکھڑ جائیں اور جسم بکھر جائیں۔

جب ہواؤں میں سرمستی کا عالم ہو اور جھونکے شدت سے چل رہے ہوں تو جمپر کو اور بھی محتاط ہونا پڑتا ہے کہ پیراشوٹ سے لٹکا وہ یوں ہلارے لیتا ہے گویا آم کے درخت پر پینگیں بڑھا رہا ہو۔ ایسی صورت میں زمین پر اترا نہیں جاتا بلکہ جمپر دھڑام سے یوں گرتا ہے جیسے جھولے والا ٹہنا شاخ سے ٹوٹ گیا ہو۔ ایسے میں کیا کیا جائے؟ یہی کچھ سکھانے کے لیے طلبہ کو پی ایل ایف پر تربیت دی جاتی ہے جو سونگ لینڈنگ فال ٹرینر کا مخفف ہے۔ اس میں طلبہ کو ہارنس پہنا کر کچھ بلندی پر واقع ایک پلیٹ فارم سے چھلانگ لگانے کو کہا جاتا ہے

چھلانگ لگانے کے بعد ابھی جمپر ہوا میں جھول ہی رہا ہوتا ہے کہ رسے جو اسے تھامے ہوتے ہیں ڈھیلے کر دیے جاتے ہیں۔ اور جمپر بکمبخت زمین پر آ گرتا ہے۔

ماک ٹاور Mock tower

اپنے ہاں کے شاعروں کے تمام روایتی طویل قامت محبوب قبروں سے اکھاڑ اکھاڑ جمع کر کے زندہ کیے جائیں اور پھر انہیں ایک دوسرے کے شانوں پر سوار کرایا جائے تب بھی وہ اس ماک ٹاور کی بلندی کو نہ پہنچ سکیں۔ جو سکول والوں نے طلبہ کی تربیت کے لیے کھڑا کروایا ہے۔ مقصد اس مینار کا قریباً قریباً وہی ماحول اور حالات پیدا کرنا ہے جو ایک جمپر کو جہاز سے چھلانگ لگاتے ہوئے پیش آتے ہیں۔ طلبہ ہارنس پہن کر جب سب سے اوپر والی منزل پر پہنچتے ہیں تو انھیں دو ہکوں (Hooks) کی مدد سے ایسی پٹیوں سے کس دیا جاتا ہے جن کے اوپر والے سرے فضا اور ایک چرخی (Pully) سے جڑے ہوتے ہیں اور یہ چرخی لوہے کے ایک موٹے رسے پر جمپر کو دور ایک ٹیلے تک لے جاتی ہے جہاں جمپر کے ساتھی اس کے لیے چشم براہ ہوتے ہیں اور بحفاظت نیچے اتار لیتے ہیں۔

ٹاور سے چھلانگ لگانے پر جمپر کچھ لمحوں کے لیے ہوا میں آزاد رہتا ہے اور ایک پتھر کی طرح نیچے گرتا ہے تاآنکہ چرخی سے لٹکی پٹیوں کا جھول ختم ہوتا ہے اور جمپر ان سے لٹک کر ٹیلے کی جانب اپنا سفر شروع کرتا ہے۔

اس کمبخت ٹاور سے سیدھی سادی جمپ لگائی ہو تو کوئی بھی مشکل پیش نہ آئے۔ انسان آنکھیں میچ، خدا کا نام لے، ہر چہ بادا باد کا نعرہ لگاتے ہوئے جمپ کر ہی جائے لیکن اس بلندی پر پہنچ کر جب کہ انسان کی ہستی ویسے ہی گم ہوئی ہوتی ہے۔ حکم یہ ہے کہ ٹاور چھوڑتے ہوئے آنکھیں کھلی ہوں، پنجے ملے ہوں، بازو پہلوؤں سے جڑے ہوں، گردن جھکی ہو اور ہاتھ ریزرو پیراشوٹ پر دھرے ہوں۔ ایک آدھ حکم ہو تو انسان یاد بھی رکھے اتنی بہت سی چیزیں یاد رہیں؟ کیونکہ یہیں تو گھر والے دو سے زائد سبزیاں لانے کو کہہ دیں تو اچھا بھلا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے کہ کوئی جگہ کچھ ہو، مٹر کی جگہ کھمبی اور ٹنڈوں کی بجائے

بھنڈیوں کا آ جانا معمول کی بات ہے۔ گھر میں جھگڑا شروع ہو تو ہم یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم لا چکے وہی کھلانے کا حکم، ملا تھا جیسی ـــــ اسی طرح کی صورت حال ٹاور پر پیش آئی۔ ٹریننگ کے صوبیدار صاحب ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جمپ کرتے ہوئے آپ کے بازو پہلوؤں سے جدا تھے اور ہم انھیں یاد دلا رہے ہیں کہ صاحب پچھلی بار آپ نے ہماری آنکھیں بند ہونے پر اعتراض کیا تھا جو اس بار کھلی تھیں چنانچہ ہمیں پاس کیا جائے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب اس بار آپ کی گردن فرعون کی طرح اکڑی ہوئی تھی اسے جھکائیں جہاز پر یہ حرکت کی تو واسٹر لگنے سے کان اڑ جائیں گے۔ ہمارا اصرار کہ یہ گردن خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مت نوٹ کریں۔ آپ ٹاور کے بارے میں ایک اور قباحت یہ ہے کہ وہاں سے نیچے کی طرف دیکھیں تو گھگھی سی بندھ جاتی ہے۔ رہا سہا اعتماد رخصت ہو جاتا ہے اور ساری جرأت و ہمت الوداعی سلام کہہ کر چلتی بنتی ہے۔ اب ہر شریف آدمی کو اس کا علاج یہی نظر آئے گا کہ نیچے نہ دیکھا جائے لیکن حکم یہ ہے کہ دروازے میں کھڑے ہو کر نیچے بیٹھے ہوئے صاحب سے آنکھیں چار کریں اور اپنا نمبر بلند آواز میں پکاریں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ ایک طالب علم بیچارہ خدا خدا کر کے اوپر پہنچتا ہے۔ دروازے میں کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوری قوت سے چلاتا ہے، "نمبر ڈبل فائیو صاب" لیکن پیچھے کھڑا اسٹاف گردن سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے سے سر نیچے کر دیتا ہے اور کہتا ہے "ابھی شاؤٹ کریں نمبر صاب" اب وہی زمین کہ جسے کچھ لوگوں نے دھرتی ماتا کے نام سے پکارا ہے اور کچھ لوگوں نے آغوش مادر سے تشبیہ دی ہے۔ لپ لپ کرتی تڑپ کر جانے والی ایک بلا کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ تب جو آواز صاحب کے حلق سے نکلتی ہے وہ اس چڑیا کی آواز سے مختلف نہیں ہوتی جسے بہت سے بچوں نے سنگسار کر کے دم توڑنے پر مجبور کر دیا ہو۔

صاحبو! یہاں ان اصطلاحوں کی تشریح اور تعریفیں ختم ہوتی ہیں جو سکول میں رائج ہیں اب آپ ہمارے ساتھ سکول چلیں اور یہاں جفاکشی کے ساتھ ساتھ جو لطیفے جنم لیتے ہیں جو چٹکلے ابھرتے ہیں اور قدم قدم پر سکواڈروں کے جو شگوفے کھلتے ہیں ان کی خوشبوؤں سے لطف اندوز ہوں۔

اُڑنے نہ پائے تھے کہ ....

رکشہ سکول کے صدر دروازے پر رکا تو نکلتے ہوئے قد کے ایک باوقار سے نوجوان نے کہ جس کی ٹوپی اس کے ایس ایس جی کا سپاہی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی ہمارا استقبال کیا اعتماد سے بھرپور مسکراہٹیں چہرے پر لیے اس نے ہم سے ہاتھ ملایا تو ہم اس شش و پنج میں پڑ گئے کہ موصوف صرف جوان ہے یا صوبیدار ٹائپ کی کوئی چیز اس کے رینک کے بارے میں ہمارا یہ سارا مخمصہ صرف اس وجہ سے تھا کہ سامان رکشے میں پڑا تھا اور افسر ہونے کے ناطے ہم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھے کہ یہ صاحب لپک کر ہمارا سامان اٹھائیں اور کسی ایسی قیام گاہ تک جہاں خنک کمرے ہوں اور ان میں قرینے سے لگے بستر، ہماری رہنمائی کریں لیکن یہ ذاتِ شریف جو تحقیق پر محض ایک جوان ثابت ہوئے اور جن کے بھرپور اعتماد کی وجہ ان کا ایس ایس جی سے متعلق ہونا ہی نظر آیا۔ ہمارا سامان اٹھانے کی بجائے براہِ راست رکشہ ڈرائیور سے مخاطب تھے اور اسے ایک بیرک کا راستہ سمجھا رہے تھے۔ جی ہاں! وہ ہمیں کسی آفیسرز میس میں نہیں کسی بیرک میں بھجوا رہے تھے

"ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔" ہم نے اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھا۔

"بھئی دیکھو! ہمارا نام کیپٹن اشفاق ہے ہم یہاں پیرا کورس کریں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے سر! یہ قریب ہی ہے۔ بیرک نمبر ۱ میں آپ کا انتظام کیا گیا ہے۔"

اس نے جیسے بڑے ادب سے ایک چپت رسید کر دی ہو۔

ایک جھٹکا سا لگا لیکن ایک اور کوشش کر دیکھنے میں بھی کوئی حرج نظر نہ آیا۔

"یہ باقی افسروں سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"تمام افسر وہیں ملیں گے آپ کو۔"

بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ گومگو کی کیفیت لیے رکشا والے کو اس جگہ چلنے کو کہا جو ہمنا تو اچھا بھلا آفیسرز میس چاہیے تھا لیکن ہے یہ جوان اپنی جہالت کی وجہ سے بیرک کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں تمام خوش فہمیاں رخصت ہو گئیں۔ ہمیں واقعی ایک بیرک میں ٹھہرایا جا رہا تھا۔ رکشے والے کو رخصت کر کے ہم نے بیرک کا جائزہ لیا۔ چالیس پچاس بستروں پر مشتمل ایک وارڈ نما طویل کمرے میں دو رویہ چارپائیاں بچھی تھیں۔ چھت سے تین سلاخیں لٹکی ہوئی تھیں جن کے نچلے سروں پر تین پر جڑے ہوتے تھے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ دھات کے ان عناصر پر بجلی کے پنکھے ہونے کا الزام ہے۔ اوّل تو زیادہ وقت یہ طلبہ کی حالتِ زار دیکھ دیکھ کر دم سادھے رہتے تھے لیکن کبھی کبھار جب بجلی کی قوت میں اضافہ ہو جاتا اور دائیں بائیں لگے بلب یوں جلنے بجھنے جیسے دور دراز گاؤں کا کوئی معصوم بچہ پہلی بار شہر آکر آنکھیں پٹ پٹا رہا ہو، تو یہ پنکھے بھی کسی دم توڑتے مریض کی نبض کی طرح چلنے لگتے۔

اسی طرح کی دو تین بیرکیں اور تھیں۔ ہم نے ایک جگہ کہ کھڑکی سے قریب تھی اور جہاں کم از کم دن کے وقت باہر سے مناسب روشنی ملنے کا امکان تھا، بستر جمالیا۔ سامان چارپائی کے نیچے سرکایا اور متلاشی ہوئے کسی باتھ روم کے کہ راحت افزا غسل کے ذریعے سفر کی تکان دُور کی جائے۔ معلوم ہوا غسل خانے میلوں گز دُور واقع ہیں۔ تولیہ اور صابن لیے وہاں پہنچے تو پہلے سے کچھ لوگ باری کے منتظر تھے۔ اس کے بعد بھی وہاں قیام کے دوران یہی ہوتا رہا کہ کچھ لوگ برش منہ میں دبائے نفسا نفسی کے عالم میں خالی باتھ روم تلاش کر رہے ہوتے تو کچھ لوٹے اٹھائے ضبط ضبطی کے عالم میں کسی خالی جگہ کی جستجو۔ وہ جنہیں انتظار کی یہ زحمت گوارا نہ تھی راتوں کے پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ ان جھگڑوں سے فارغ ہو آیا کرتے۔

خدا خدا کر کے ہماری باری آئی۔ باتھ روم میں گئے تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی ثانوی مدرسے کی سائنس لیبارٹری میں آ گئے ہوں۔ وہ چیز کہ جسے نکلا ہونا چاہیے تھا۔ خمار نکلی تھی اور اس برآمد ہونے والی چیز تھی۔ قے بے رنگ بے بو اور بے ذائقہ ہی لیکن اس کی مقدار اتنی تھوڑی تھی کہ جسم کے کسی بھی حصے کو گیلا کرنے کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پائپ کو ہلانے جلانے پر یکبارگی ایک شور سا اٹھا جیسے آکسیجن اور ہائیڈروجن باہم ٹکرا گئی ہوں۔ اور پھر اچانک پانی بہنا شروع ہو گیا۔ ہم نے موقع غنیمت جان کر جسم بھگویا اور جلدی جلدی صابن ملنے لگے۔ لیکن جب تک ہم فارغ ہوتے پانی رخصت ہو چکا تھا۔ پھر پائپ کو چھیڑا لیکن وہ ایک شور کر کے پھر چپکا ہو رہا۔ اب ہمیں نہ تو یہ معلوم تھا کہ پانی بنانے کا یہ کیمیاوی عمل کہاں واقع ہو رہا ہے اور نہ ہم اس پوزیشن میں تھے کہ وہاں جا کر ان کی اصلاح کر سکتے جو متعلقہ گیسوں کو ٹھیک نسبت سے ملا نہیں رہے تھے صبر شکر کر کے بیٹھے رہے اور جب پانی کے قطرے دوبارہ کسی بیوہ کے آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے تو جسم پر لگے صابن سے مشکل نجات حاصل کی اور جسم پونچھ پانچھ باہر نکل آئے

کپڑے تبدیل کر کے دفتر کی جانب چلے کہ کورس سے متعلق ہدایات حاصل کی جائیں۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ایک بورڈ پر نظر پڑی جس پر گیٹ ٹن (Get ten) لکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس مرض کی دوا ہے۔ خراماں خراماں آگے بڑھے تو ایک اور بورڈ پر لکھا تھا ووڈو۔ وونٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وونٹ کے نیچے ایک وردی پوش انسان کی تصویر تھی جو ڈنٹر پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھا۔ سکول سے متعلق روایات یاد آئیں تو ان بورڈوں کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا۔ لیکن ہم انہیں نظر انداز کرتے ہوئے دفتر پہنچ گئے۔ وہاں مختلف نوٹس لگے ہوئے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ہمارے قیام کا انتظام تو بیرک میں ہے لیکن طعام کا بندوبست ایک آفیسرز میس ہی میں کیا گیا ہے۔ ایک گونہ اطمینان ہوا ۔ لیکن جب ساتھ کھڑے ایک اور افسر سے کہ جنہیں مقامی ہونے کے ناطے شہر کے جغرافیے پر عبور حاصل تھا میس کا محل وقوع دریافت کیا تو محسوس ہوا کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کولمبس کا سا تجسس واسکوڈے گاما کا سا جگر اور مجنوں کی سی دشت نوردی کی عادات کا ہونا ضروری ہے جو بدقسمتی سے ہم میں مفقود تھیں۔

انہی میں سے ایک بورڈ خاصا چونکا دینے والا تھا۔ لکھی تحریر کے اصل الفاظ تو ہمیں یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم اور اندازِ تحریر کچھ یوں تھا۔ آپ افسر ہیں؟ ہوں گے! یہ پیرا سکول ہے

براہ مہربانی اپنے شانوں سے افسری کے چاند ستارے اتار رکھیے تا حکم ثانی سنبھال رکھیے اور کل سورج نکلنے سے پہلے اتنے بجے فلاں جگہ فال ان ہو جایئے۔"

رات بھر خواب ہائے پریشاں نے ہم کو سونے نہ دیا۔ کبھی ہم ٹاور سے جمپ کرتے شرماتے کبھی جسمانی مشقوں سے گھبراتے۔ کبھی کسی چیختے چلاتے سٹاف کا چہرہ ابھرتا تو کبھی پیراشوٹ جہاز کے دروازے میں جا الجھتا۔ کبھی پی ایل اے بناتے ہوئے ہڈیاں چٹخنے لگتیں تو کبھی ٹک نہ لینے پر سرزنش ہوتیں اور یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے رات کا پچھلا پہر آن پہنچا۔ بستر کو چھوڑا اور اس سے پہلے کہ صبح کی سپیدی آسمان کے جھروکوں سے جھانکتی ہم نہا دھو کر ہشاش بشاش چہرہ لیے "بے نام" سی ایک وردی پہن کے تیار ہو گئے۔ اور پھر تو

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

شانوں پر چمکتے وہ تارے کہ فوج میں جن سے محمود و ایاز کی پہچان ہوتی ہے، غائب تھے چنانچہ کچھ دنوں تک یہ طریق چلا کہ ایاز محمود بنا پھرتا ہے اور محمود ایاز کہلاتا ہے تا آنکہ سکول والوں نے سینیارٹی کے مطابق تمام لوگوں کو نمبر دیے اور اس کے بعد ہر شخص نام کی بجائے اپنے نمبر سے پکارا جانے لگا۔ نمبر ایک رینک میں کرنل تھے۔ ان کے بعد کے نمبر میجروں کے لیے اور پھر کپتانوں کے لیے وقف تھے اور سب سے آخر میں آتے تھے، ہمارے ساحلوں کے محافظ طویل قامت ملاح۔ سینیارٹی ملحوظ رکھنے کا یہ تھوڑا بہت اہتمام غالباً صرف طلبہ کے لیے تھا کہ وہ ایک دوسرے کا احترام رکھیں ورنہ سٹاف پہلے اور آخری نمبر کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہ تھے بلکہ اکثر ابتدائی نمبر والے شانوں کی زیادہ سے زیادہ "توجہ" کے مستحق ٹھہرتے تھے۔

سب سے پہلے داخلے کا امتحان ہوا۔ کبھی طلبہ کو کسی بار سے توریوں کی طرح لٹکا دیا گیا اور حکم ہوا کہ چھاتی کو بار تک بلند کریں۔ کہیں انھیں زمین پر لٹا کر کہا گیا کہ اپنی پیشانیوں سے گھٹنوں کو مس کریں۔ مختلف مشقتوں سے گزارنے کے بعد نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ پاس ہونے والے مسکرا اٹھے۔ فیل ہونے والوں کے بجھے چہرے سکول والوں سے دیکھے نہ گئے چنانچہ انھیں مزید ایک ہفتے کی مہلت دی گئی کہ سکول کے قیام کے دوران وہ اپنی کھوئی ہوئی قوت بحال

کریں، انھیں دوبارہ آزمایا جائے گا۔

اس کے بعد سب ایک گھنے پیڑ کے سائے تلے جمع ہو گئے۔ یہ سکول کے کمانڈنٹ کے افتتاحی خطاب اور سٹاف سے تعارف کی تقریب تھی۔ مختصر سا خطاب اور اچٹتا ہوا تعارف لیکن یہ اختصار اور یہ تعارف ہمیں حیرتوں میں ڈبو گیا۔ یہ عجیب شخص سے شکل و شبیہ والے سٹاف اور ان کی حرکتیں! کوئی جہاز سے تین تین سو بار جمپ کر چکا تھا، کوئی ہزاروں میل پیدل چلا تھا۔ کوئی آسمان کی بلندیوں سے پیراشوٹ کھولے بغیر چند منٹ لٹکا آتا تھا اور زمین سے صرف سو فٹ ادھر پیراشوٹ کھولتا تھا تو کوئی کھلے ہوئے پیراشوٹ کو ڈھائی منٹ میں پیک کر کے دوبارہ چھلانگ لگانے کے لیے تیار کر سکتا تھا۔ ہم نے دل میں دعا کی کہ یا اللہ اس سٹاف کے ہاتھوں پیک ہونے والا پیراشوٹ تو ہمارے حصے میں نہ آئے۔ کون جانے جہاز سے چھلانگ لگانے کے بعد بھی یہ پیراشوٹ پیک ہی رہے۔ کہاں ڈھونڈتے پھریں گے ہم اس سٹاف کو اس وقت۔

ابھی ہم سٹافوں کے چہرے دیکھتے ہوئے اور ان کی تحسین میں کہے گئے کمانڈنٹ کے الفاظ کا موازنہ ہی کر رہے تھے کہ یہ تقریب ختم ہو گئی۔ وہی سٹاف جو اپنی تعریف سن سن کر مرغیوں کی طرح سینے پھلائے بیٹھے تھے، اصیل مرغوں کی طرح ہماری جان کو آ گئے۔ ساری خاموشیاں رخصت ہو گئیں اور چیخ چلا کر انھوں نے ہمیں فال ان کر دیا۔ مسکراتی آنکھوں میں سرخ ڈورے کھنچ گئے اور چہروں کی ملائمت کرختگی سے بدل گئی...... اور اس کے ساتھ ہی ہماری تربیت کا آغاز ہو گیا۔

منہ اندھیرے اٹھا کر وہ ہمیں پی ٹی کے لیے جایا کرتے۔ بسم اللہ ایک طویل ٹریک پر ڈبل مارچ سے ہوا کرتی۔ جب دوڑتے دوڑتے سانس اکھڑنے لگتا، قدم ڈگمگانے لگتے، آنکھوں کی پتلیاں چھپنے لگتیں اور پسینہ ایڑیوں تک بہنے لگتا تو اباؤٹ ٹرن کا حکم ملتا۔ اس وقت ہمارا منہ مشرق کی جانب ہو جایا کرتا۔ دور افق پر کبھی شفق کے سارے رنگ سمٹے ہوتے تو کبھی دھنک کے سب رنگ بکھرے ہوتے۔ کبھی گھٹاؤں کا عالم ہوتا جیسے کسی نے زلف بکھرا دی ہو اور کبھی فضاؤں پہ بے خودی سی طاری ہوتی جیسے کسی نے کوئی نغمہ گنگنا دیا ہو۔ کبھی بادلوں کی

تمیں بنا بنا کر سورج ابھرنا چاہتا جیسے بند قبا کھل جانے پر جلوے بے تاب ہونے لگیں کبھی چاروں طرف ہلکی ہلکی دھوپ چمک رہی ہوتی جیسے کسی گستاخی پر پسینے بھرے گال تمتما اٹھیں، جگمگا اٹھیں۔

انہی نظاروں میں کھوئے ہم سکول پہنچتے۔ اندر داخل ہوتے ہی چاروں جانب سے شاؤٹ کی چیخ و پکار سنائی دیتی: "گٹ ڈاؤن۔ گٹ ڈاؤن"۔ ہم فوراً زمین بوس ہو جاتے۔ اٹھ کر دوڑتے گراؤنڈ کا ایک اور چکر لگانا پڑتا جس کے قریب سکول کی "عمل درآمد کونسل" کا ایک اور شاؤٹ کھڑا ہوتا۔ ہم پھر زمین سے لپٹ جاتے۔ پی ٹی گراؤنڈ تک پہنچتے پہنچتے یہ عالم ہوتا کہ بازوؤں میں جان باقی رہتی نہ ٹانگوں میں جسم کو سہارنے کا یارا لیکن پہاڑ سا پیریڈ ابھی باقی ہوتا اور سٹاف کسی طالب علم کو لمحے کے کسی مختصر سے حصے کے لیے بھی پرسکون نہ دیکھ سکتے تھے۔ جو ذرا سی دیر کے لیے چوکتا، بآواز بلند اس کا نمبر پکار کر کہا جاتا، "وائیک پی ٹی — نمبر فائیو سیون:"

ایک منشی نما سٹاف جھٹ پٹ اس نمبر کو یوں نوٹ کرتا جیسے کوئی سود خور بنیا اپنے بہی کھاتوں میں کسی غریب کو دیے گئے قرض کے سود کا اندراج کر رہا ہو۔ پی ٹی پیریڈ کے دوران پکارے جانے والے تمام نمبر شام کو پھر اسی گراؤنڈ میں جمع ہوتے۔

پی ٹی کی مشقیں سیدھی سادی ہوتیں تو گوارا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ جب اچھل کود کی بہت سی منزلیں طے پا جاتیں اور جب کھڑے کھڑے ہم آسمان سے تارے توڑنے میں ناکام ہو جاتے تو شرابور پسینے کے ساتھ ہمیں زمین پر لٹا دیا جاتا اور پڑے پڑے ایسی مشقیں کرائی جاتیں کہ پورا جسم کیچڑ بن جاتا۔

پی ٹی پیریڈ کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ ہوتا۔ ہم بیرک واپس آتے اور بنیان اتار کر خود کو اردلی کے حوالے کر دیتے جو پانی لے لے ہماری گردن، شانوں اور سر کو یوں دھو ڈالتا کہ جیسے سردیوں میں نہانے سے بدکنے والے بچوں کی ماں زبردستی ان کے سر دھلا رہی ہو۔ غسل سے فارغ ہو کر تولیوں میں لپٹ، ہم ناشتہ کرتے اور لیٹ جاتے۔ کس قدر سکون ملتا اس غنودگی میں جو اتنی تھکن کے بعد طاری ہوتی تھی۔ یہ ایک گھنٹہ پانچ منٹ میں گزر جاتا اور

ڈانگریاں پہنے سٹیل ہیلمٹ ہاتھوں میں اٹھائے ہم سکول کی طرف چل دیتے۔

سکول میں آنے کے ایک دو دن بعد کی بات ہے کہ ہم نے جسم کے مختلف حصوں میں درد کی شکایت محسوس کی۔ بازوؤں، پنڈلیوں، رانوں اور کمر میں ہونے والے درد تو سمجھ میں آنے والے تھے کہ جس بے دردی سے ہمیں پی ٹی میں مصروف رکھا جاتا تھا اس کا لازمی نتیجہ اسی شکل میں نکلنا تھا لیکن تشویش ناک بات یہ تھی کہ ہمارے گلے کی پرانی خرابی لوٹ آئی تھی۔ گلے کے ٹانسلز ہمیشہ ابھر ابھر کر تنگ کرتے رہتے تھے۔ ایک دو بار ڈاکٹروں نے اپریشن کا مشورہ بھی دیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید ہم مریض بن جانے پر غور فرماتے۔ ہوتا ہے ایک وقت جب انسان خواہ مخواہ بیمار کہلوانا پسند کرتا ہے۔ درد کو سینے سے لگانے کی خواہش کرتا ہے، چاہتا ہے ہاتھ پاؤں توڑ کر بستر پر پڑ جائے۔ اس کا جسم بخار سے پھنکنے لگے، آنکھیں لال ہو جائیں، پیشانی تر بتر —— ایسی جھوٹی خواہشوں کے لاشعور میں بڑی شریر تمنائیں مچلتی ہیں۔ حنائی انگلیوں کا نبضیں ٹٹولنا، مضطرب دباؤ، پیشانی پر مرمریں ہاتھوں کا سایہ، کڑوی کسیلی دوائیں پینے پلانے پہ انکار و اصرار، چپ رہنے پر تشویش، "کچھ بولو نا۔ جی بہل جائے گا۔" قسم کی فرمائشیں۔ "زیادہ مت بولیں، طبیعت بگڑ جائے گی" قسم کی فہمائشیں۔ ان سب باتوں کے درمیان جو نبضیں ڈوبتی ابھرتی ہیں، وہ دل کی نئی دھڑکنوں کی خبر دیتی ہیں لیکن ہم جہاں تھے وہاں مریض بننا مردانگی کی توہین تھی۔ ذرا سی بیماری ہمیں "کورس نکالا" دینے کو کافی تھی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ وہاں حاتمی نمبر نہیں ملا کرتے۔ اور ہم نے ہر قیمت پر کورس مکمل کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا چنانچہ کسی سے اپنے درد کا ذکر نہ کیا۔

ایک دن پڑوس والی چارپائی پر بیٹھے ایک ہمسائے نے ہمیں گلا سہلاتے دیکھا تو بولا۔ "یار یہ باقی جسم کی تو خیر ہے لیکن یہ گلا جانے کیوں بے سرا ہوا جا رہا ہے۔"

عین اسی وقت ایک اور صاحب آیوڈیکس کی شیشی تھامے گلے کے جملہ امراض کی تفصیلات بتانے آن پہنچے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ اس حمام میں ہم سب ایک جیسے تھے۔

ہمیں نانسلز کی نہیں پی ٹی کی بیماری تھی۔

پی ٹی کے بعد ہمیں مختلف اڈوں پر تربیت دی جاتی تھی۔ ہر جگہ سٹاف کا حکم چلتا تھا۔ وہ چاہتا تو جہاز فضاؤں میں پرواز کرتا کرتا یکلخت ساکن ہو جاتا یا رن وے سے اٹھے بغیر اچانک فوراً آپ زون پر پرواز کر رہا ہوتا۔

تربیت کے اور بہت سے مراحل میں ایک مرحلہ معلق ہارنس کا تھا۔ انگریزی میں اسے (Suspended Harness) کہتے ہیں۔ صورت اس کی کچھ یوں ہے کہ طلبہ کو ہارنس میں جکڑ کر ایک اونچے سے پلیٹ فارم پر لٹکا دیا جاتا ہے اور ایک سٹاف سامنے کھڑا مختلف قسم کی صورت حال کی منظر کشی کرتا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ نیچے دائیں جانب نہر آ گئی ہے۔ طالب علم وہ کارروائی کرتا ہے جو نہر سے بچنے کے لیے کی جا سکتی ہے۔ پھر حکم ملتا ہے کہ تم درخت پر گرنے والے ہو بچو۔ طالب علم ڈوریوں کو کھینچ تان کر درخت سے بچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بجلی کے تاروں پر آن گرا ہے۔ اب اصولاً اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جانی چاہیے۔ لیکن اسے پھر زندہ قرار دے کر کہیں اور اترنے کا حکم ملتا ہے۔ اس ساری کارروائی کے دوران بازو شل ہو جاتے ہیں، ڈوریاں کھینچ کھینچ ہتھیلیوں میں خون چھلکنے لگتا ہے، گردن یوں ڈھلک جاتی ہے جیسے منکا ٹوٹ گیا ہو...... اور...... اور...... اب آپ کو کیا بتائیں...... ہارنس کی پٹیاں ایسی ایسی نازک جگہوں سے گزرتی ہیں کہ...... طلبہ بلبلا کر دعا کرتے ہیں کہ اے کاش ان کا پیراشوٹ ہی نہ کھلا ہوتا، وہ جہاز سے بندھے رہ جاتے، فضاؤں میں بکھر جاتے، بجلی کے ننگے تاروں سے الجھے رہ جاتے لیکن اس اذیت میں گرفتار نہ ہوتے۔ تنگ آ کر کوئی چیخ اٹھتا "سٹاف اتنی دیر میں تو انسان چاند سے زمین پر پہنچ جاتا ہے ہم جہاز سے زمین پر نہیں پہنچے"۔ اور سٹاف مسکرا کر کہتا "صاحب بچیں، بچیں، آپ جھیل میں اتر رہے ہیں"۔

سٹاف کی آواز آتی "تیار ہو جائیں، زمین آ رہی ہے"۔ ہم پوزیشن بنا کر لینڈ کرنے کو تیار ہو جاتے لیکن زمین آتے آتے پھر قیامت میں بدل جاتی۔

اس اڈے سے جان چھوٹی تو ہمیں سیس ایل ایف ٹی نے آ لیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے



ٹاور سے ٹیلے کی طرف

یہ مختلف ہے سوئنگ لینڈنگ فال ٹرینر کا۔ ہوا تیز چل رہی ہو تو پیراشوٹ نیچے اترنے کے ساتھ ساتھ جمپر کو دائیں بائیں جھولا بھی جھلاتا رہتا ہے اور ایسی حالت میں زمین پر اترنے کی تربیت اس ایل ایف ٹی پر دی جاتی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پیرومیٹر کے مطابق ہوا کا دباؤ کم ہو یا زیادہ، طلبہ اسے خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن اگر سٹاف کا پارہ چڑھ جائے تو پھر ہواؤں میں جو شدت آتی ہے اسے کوئی پیرومیٹر ریکارڈ ہی نہیں کر سکتا، طلبہ برداشت کیوں کر کریں؟ تربیت کا طریقہ یہ ہے کہ طالب علم ہارنس پہنے ایک اونچے پلیٹ فارم سے چھلانگ لگاتا ہے اور کچھ تختوں سے لٹکا جھولتا رہتا ہے۔ جب اس کی رفتار کم ہونے لگتی ہے اور وہ زمین کی طرف آ رہا ہوتا ہے تو اسے وارننگ دیتے ہوئے رسے ڈھیلے کر دیے جاتے ہیں اور وہ بتائے گئے طریقے کے مطابق زمین پر آ گرتا ہے لیکن نصیب دشمناں سٹاف کی طبیعت ناساز ہو جائے تو فضاؤں میں طوفانوں کی آمد کون روک سکتا ہے۔ طالب علم پلیٹ فارم

چھوڑ کر مخالف سمت میں بلند ہو رہا ہوتا ہے کو رسّے ڈھیلے کر دیے جاتے ہیں اور وہ تباہ شدہ جہاز کی طرح سیدھا زمین پر آ رہتا ہے۔ ایک لمحے کو تو اس میں زندگی کے آثار مفقود ہو جاتے ہیں لیکن پھر شاف کی آواز اُبھرتی ہے: "اٹھیں! اٹھیں! کھڑے ہو جائیں۔ جہاز سے چھلانگ لگائیں گے تو موسم آپ کی مرضی کا نہیں ہوگا۔ ہوا اپنی مرضی سے چلتی ہے۔ آپ آنکھیں کھلی رکھا کریں۔"

ہم کھلی آنکھوں جو کچھ دیکھ رہے تھے، شاف کو کیوں کر بتاتے۔ جغرافیہ کے ناطے موسم مہینوں اور سالوں کے حساب سے بدلتے ہیں لیکن شاف کے ہاتھوں طلبہ لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کر لیتے ہیں۔ شاف ہشاش بشاش ہوتا تو موسم پرسکون رہتا۔ یوں لگتا ساون کے موسم میں گاؤں کی مٹیاریں گھنے درختوں پر جھولے ڈالے ملہار گا رہی ہوں۔ اور کوئی بات شاف کی منشا کے خلاف ہو جاتی تو لگتا ایک سوں سوں ہوائیں چلنے لگیں گرد و باراں کے طوفان آ جاتے یا پھر بحیرہ عرب کے سارے سائیکلونوں کا رُخ ایس ایل ایف ٹی کی جانب ہو جاتا۔

اس کے بعد ہمیں جہاز میں سوار ہونا سکھایا گیا۔ اُڑتے جہاز میں توازن برقرار رکھنے کی مشق کرائی گئی اور سٹیٹک لائن (Static line) تھامنے کے آداب سے روشناس کرایا گیا۔ جب جمپر جہاز سے چھلانگ لگاتا ہے تو پشت پر سوار پیراشوٹ نائلون کی ایک مضبوط رسّی سے بندھا ہوتا ہے جس کا دوسرا سرا جہاز میں لگی لوہے کی ایک سلاخ سے بندھا رہتا ہے۔ چھلانگ لگانے پر جب اس رسّی میں تناؤ پیدا ہوتا ہے تو جھٹکے سے پیراشوٹ کھل جاتا ہے اور یہ رسّی خود ٹوٹ کر جمپر کا ناطہ جہاز سے توڑ دیتی ہے۔ یہی رسّی "سٹیٹک لائن" کہلاتی ہے۔ دایاں ہاتھ کاندھے سے اوپر اٹھائے کھڑے کھڑے اسے اُس وقت تک تھامے رکھنا ہوتا ہے جب تک چھلانگ لگانے کے لیے آپ جہاز کے دروازے تک نہ پہنچ جائیں۔ اسے تھامے رکھنے کی مشق کے دوران ایک بار ایک طالب علم کا بازو کچھ ڈھیلا پڑ گیا تو ٹریننگ کے صوبیدار صاحب آنکھیں لال پیلی کرتے اس کے سر پر سوار ہو گئے: "صاحب — آپ نے سٹیٹک لائن پکڑ رکھی ہے یا اونٹ پکڑ رکھا ہے" اور موصوف کا بازو خود کار مشین کے لیور کی طرح خود بخود بلند ہو گیا۔

اب ہم جہاز میں سوار ہونا بھی سیکھ چکے تھے۔ اس میں بیٹھنا اور چلنا پھرنا بھی، چھلانگ لگانا اور زمین پر اترنا بھی لیکن ایک مرحلہ اور بھی تھا: جیپ ڈریگ (Jeep Drag) یعنی جیپ سے بندھ کر گھسیٹا جانا۔ اس کا فلسفہ یہ بیان کیا گیا کہ اگر ہوا تیز چل رہی ہو تو زمین پر اترنے کے بعد پیراشوٹ خود بخود بند نہیں ہو جاتا بلکہ جمپر کو گھسیٹے لیے پھرتا ہے۔ ایسے میں خود کو پیراشوٹ سے آزاد کیوں کر کیا جائے؟ اسی کی تربیت کے لیے یہ انتظام ہے اور خاصا ہولناک انتظام۔

طلبہ کو ہارنس پہنا، جیپ سے باندھ، پشت کے بل زمین پر لٹا کر جیپ چلا دی جاتی ہے۔ ایک خاص فاصلہ پر پہنچ کر حکم ملتا ہے: "Go"۔ اس کا اردو ترجمہ تو یہی ہونا چاہیے کہ "چلے جاؤ" لیکن طلبہ جائیں تو کہاں جائیں۔ کسی شاعر نے کہا تھا؎

جذبۂ شوق سلامت ہو تو انشاءاللہ
کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

لیکن یہاں کچا دھاگا نہیں۔ موٹے موٹے نائلون کے رسّے آپ کو جیپ سے باندھے رکھتے ہیں۔ سو جذبۂ شوق سلامت رہے نہ رہے آپ جیپ سے بندھے چلے جاتے ہیں۔ ادھر ڈرائیور کی سیٹ پر کوئی نا اہل بیٹھا ہوتا ہے جسے جیپ ڈریگ کے بہانے کار والے ڈرائیونگ کی تربیت دے رہے ہوتے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ایک پنتھ دو کاج۔ سکول والے پٹرول طلبہ کے نام پر حاصل کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں سکول میں آنے والے نئے سپاہیوں کو ڈرائیونگ کی تربیت دینے پر۔ اسی دوران جیپ ڈریگ کے پیریڈ بھی پورے کر لیے جاتے ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ طالب علم بیچارہ جیپ کے پیچھے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے، دیوانوں کی طرح سر پٹخ رہا ہے لیکن ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے صاحب ہیں کہ انہیں معلوم ہی نہیں بریک کہاں ہے۔ ان کا علم صرف ایکسیلیٹر تک محدود ہے اور ان کا پیر اس پر کبھی اٹھ جاتا ہے کبھی دب جاتا ہے۔ ڈرائیور کا پیر نہ ہوا رئیس جعفری کے محبوب کی نگاہ ہو گئی؎

وہ نگاہ ان کی مجاز تھی کبھی جھک گئی کبھی اٹھ گئی
تو ہمیں ہم سے یہی ہوا کبھی جی اٹھے کبھی مر گئے

پر ہم جعفری صاحب نگاہوں کے جھکنے اُٹھنے سے جانے کیسے جیتے مرتے ہوں گے لیکن جیپ ڈریگ میں ڈرائیور کے پاؤں کے اٹھنے و بیٹھنے سے طلبہ جس طرح مر کے جی اٹھتے ہیں اس کی گواہی سکول کے باہر سے گزرنے والے اکثر لوگ دے سکتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اس منظر کی تشریح بدل دیتے ہیں۔ جنگ کے دنوں میں لوگ کہا کرتے تھے:

"یہ فلاں ملک کے جنگی قیدی ہیں۔ انہیں سزا دی جا رہی ہے۔"

امن کے دنوں میں یہ جنگی قیدی دشمن کے جاسوس کہلاتے یا فوج کے بھگوڑے تشریح شروع میں سکی یا کم از کم گھسیٹا زیادہ جاتا ہے لیکن جب سکول کے سٹاک سے روئی کے پیڈ اور ٹنکچر آیوڈین کم ہونے لگے تو طلبہ کو کامیاب قرار دے کر اس مشق کے اختتام کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

ایک بار زیر تربیت ایک افسر کہ نئے نئے شادی شدہ تھے ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بیگم نے اصرار کیا کہ وہ انہیں مشقیں کرتا دیکھیں گی۔ موصوف انہیں کار میں بٹھا سکول لے آئے۔ اتفاق سے اس دن بھی جیپ ڈریگ والا مرحلہ تھا اور "حسن اتفاق" یہ کہ سب سے پہلے بیگم موصوف کے سرتاج ہی کی باری تھی۔ اب وہ انہیں منا رہے ہیں کہ وہ پھر کسی دن آ جائیں ان کا اصرار کہ وہ تو دیکھ کر ہی جائیں گی آج کی مشقیں۔

بیوی کی طرف سے کہا نہ ماننے پر افسر نے غصے میں آ کر خودکشی کی دھمکی دی اور جیپ کے پیچھے آ کر لیٹ گئے۔ جب جیپ نے رفتار پکڑی تو بیگم صاحبہ چلائیں:

"لو میں جا رہی ہوں اب پھر آؤں گی لیکن خدا کے لیے تم باز آ جاؤ۔"

موصوف کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ بیوی کی طرف آئے اور مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا "آئندہ انکار کرو گی میرا کہا ماننے سے؟" پلکوں سے آنسو پونچھتی، وفاؤں کا یقین دلاتیں وہ رخصت ہو گئیں اور موصوف پھر ہم سے آن ملے۔

جیپ ڈریگ کے بعد ٹاور جمپ کی باری تھی۔ اس کمبخت ٹاور کا ذکر ہم پہلے بھی

کر چکے ہیں کہ فرعون کی طرح گردن اٹھائے بیچ سکول کھڑا ہے۔ بیاؤٹی کے پیاسینا کی طرح تھوڑا سا بھی جھک جاتا تو کچھ تو آس بندھتی۔ اس کے ایک نہ ایک دن برباد ہونے کی لیکن اسے تو ہر کورس کی آمد پر ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا ہے۔ ڈھیلے نٹ بولٹ کس دیے جاتے ہیں، پرانے تختے بدل دیے جاتے ہیں اور رنگ و روغن ہونے کے بعد اس کا گیا روپ پھر سے لوٹ آتا ہے۔ طلبہ جب تک اس ٹاور سے چھلانگ لگاتے ہوئے سکول کو مطمئن نہ کریں انہیں جہاز پر نہیں لے جایا جاتا۔ سچ پوچھیے تو جہاز سے چھلانگ لگانا آسان ہے کہ وہاں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جمپ کرنے کا حکم ملنے کے بعد ہر شخص دوڑتا ہوا دروازے تک پہنچتا ہے۔ سو میں کوئی ایک آدھ ہوتا ہوگا جو دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکتا ہو ورنہ اسی رفتار سے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ ٹھٹکنے والوں کو بھی زیادہ "غور و فکر" کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ایک نظر میں اس کا جائزہ لیتے ہیں اور سٹیٹک لائن جمپ ماسٹر اور پیرا شوٹ سٹیٹک ہینگ ہوں تو "گو" لگا کر اسے فضاؤں کے سپرد کر دیا جاتا ہے ـــــ لیکن اس ٹاور سے جمپ کے کئی مرحلے ہیں اور ہر مرحلے پر کوئی نہ کوئی سٹاف منکر نکیر کی طرح گہری گہری نظروں سے آپ کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور ٹاور کے نیچے بیٹھے صاحب ایک رجسٹر میں ہر غلطی کا اندراج کرتے رہتے ہیں۔ ٹاور پر چڑھنے سے پہلے ایک سٹاف ہارنس کا معائنہ کرتا ہے۔ پھر ایک دیوار پر چڑھا کر جمپ کراتا ہے۔ غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور ٹاور پر جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ چوتھی منزل تک پہنچتے پہنچتے جمپر کی سٹی گم ہو چکی ہوتی ہے۔ چہرے پر پریشانیوں کے آثار لیے جب وہ آخری منزل پر پہنچتا ہے تو دانت نکالتا، مسکراتا ایک سٹاف اس کا استقبال کرتا ہے۔ پھر ہکوں کی مدد سے اسے ان پٹیوں میں باندھ دیا جاتا ہے جو ٹاور سے باہر اوپر لوہے کے ایک رسے سے منسلک ہوتی ہیں۔ مین گیٹ پر کھڑا کر کے پہلے جمپر کی پوزیشن درست کی جاتی ہے۔ اتنی بلندی پر آدھا جسم باہر نکال کر کھڑا ہونا پھر رکوع کی حالت میں جھکتے ہوئے نیچے بیٹھے ہوئے صاحب کو اپنا نمبر بتانا، اپنے پیچھے کھڑے ہوئے سٹاف سے ہدایات وصول کرتے رہنا اور پھر جمپ کرنا۔ یہ ساری کارروائی جمپر بقائمی ہوش و حواس کرتا ہے

لیکن اسے کچھ معلوم نہیں ہو پاتا کہ غلطی کیا ہوئی۔ چنانچہ جمپ کے بعد اسے دست بستہ ٹاور سے نیچے بیٹھے (Assesor) کے حضور پیش ہونا پڑتا ہے جو آپ کی غلطیاں بامحاورہ زبان میں آپ پر واضح کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"آج ناشتے میں کبوتر تو نہیں کھائے آپ نے؟"

حیرانی سی حیرانی۔ "نہیں صاب۔"

"جمپ کرتے ہوئے کوئی بلی تو نظر نہیں آئی آپ کو؟"

مزید حیرانی۔ "نہیں صاحب!"

ایک دھاڑ۔ "تو پھر جمپ کرتے ہوئے آنکھیں یوں کیوں بند کرتے ہیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر کرتا ہے۔"

یا

"صاب۔ آپ بقیدِ حیات ہیں؟"

"جی صاب"

"دل ٹھیک کام کر رہا ہے آپ کا؟"

"بالکل۔"

"سانس کا رشتہ باقی ہے؟"

"ظاہر ہے۔"

ایک چنگھاڑ۔ "صاحب۔ ظاہر ہی تو نہیں ہے۔ آپ جمپ یوں کرتے ہیں جیسے کیٹ سے کوئی مردہ نکلا ہو۔"

اور اس کے ساتھ ہی دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو زمین کی طرف جھکاتے ہوئے وہ چلائیں گے۔ "ویک اگزٹ۔ ان سیٹیس فیکٹری (Week Exit Unsatisfactory) اور پھر سر جھکائے پھر ٹاور کی طرف یوں چل دیتا ہے۔ جیسے ٹاور پر نہیں سولی پہ چڑھنے جا رہا ہو۔

تھینک یُو! اللہ میاں

بالآخر یہ تمام مشقیں تمام ہوئیں اور وُہ دن آن پہنچا جس کے انتظار میں ہم نے ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارا تھا۔ پی ٹی کی مشقیں ہنستے کھیلتے برداشت کی تھیں، پارنس کی کرختگی خندہ پیشانی سے جھیل لی تھی اور ساری مشقیں صحیح طریقے سے کرنے کے باوجود شاف کی ڈانٹ ڈپٹ مسکراتے ہوئے سنتے رہے تھے۔

ہم نے ہنس ہنس کے گزارا وُہ زمانہ احسن
جس میں ہر لمحہ شرافت کی سزا ہوتا ہے

صبح سویرے نہا دھو تیار ہو، فوجی گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم فضائی مستقر پہنچ گئے وہاں پارنس اور پیراشوٹ پہلے سے موجود تھے۔ یہ پارنس ان پارنسوں سے قطعی مختلف تھے جن سے اب تک ہمیں پالا پڑتا تھا۔ یہ صاف ستھرے تھے، گرد و غبار سے پاک۔ نائلون کے دھاگے نئی دلہن کے زرتار لباس کی مانند چمک رہے تھے اور دھات کے بنے ہوئے حقے یوں آب دے رہے تھے جیسے سنار کے ہاں سے پسند کروانے کے لیے منگوائے گئے زیور۔ اپنے اپنے پیراشوٹ اور پارنس اٹھائے ہم سب رن وے پر پہنچ گئے۔ پارنس پہنا تو معلوم ہوا جسم پر اس کی گرفت میں نئی محبتوں کی سی وارفتگی ہے۔ پہلے ساتھیوں نے ایک دُوسرے کا معائنہ کیا پھر شاف نے ہر کسی کا تفصیلی جائزہ لیا اور ہر طرح سے تیار ہو کر ہم نے بے چینی سے طیارے کی آمد کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ جیسے سہاگ کی رات نئی نویلی دلہن دولہا کی منتظر ہو "جانے کیا ہوگا؟" قسم کے احساسات دل کو بے چین کیے دیتے تھے۔ افق پر ابھرتے طیارے

کی آمد و رفت کو منتشر کر دیتی تھی۔ ادھر شافت تھے کہ اٹھکیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ ایک کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شافت ذرا اٹھکا، وہ قدم پیچھے ہٹا اور تشویش بھرے لہجے میں بولا:

"صاحب، کدھر سے اٹھا لائے ہیں آپ یہ ہارنس۔ خیر اب تو آپ نے پہن لیا۔ اللہ مالک ہے۔"

یہ کہہ کر شافت تو آگے بڑھ گیا اور ان صاحب کے پسینے چھوٹ گئے۔ پہلے انھوں نے خود اپنے ہارنس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اپنے ساتھی سے اپنا معائنہ کروایا۔ انھوں نے او کے رپورٹ دی لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔ دائیں بائیں دو تین اور لوگوں کو دکھایا لیکن تشفی ہونی تھی نہ ہوئی۔ وہ گھبرائے گھبرائے صوبیدار صاحب کے پاس پہنچے۔ ادھر شافت ایک کونے میں کھڑا ان کی گھبراہٹوں کی داد و انست نکال نکال کر دے رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے انھیں یہ یقین دلایا گیا کہ شافت نے صرف مذاق کیا ہے۔

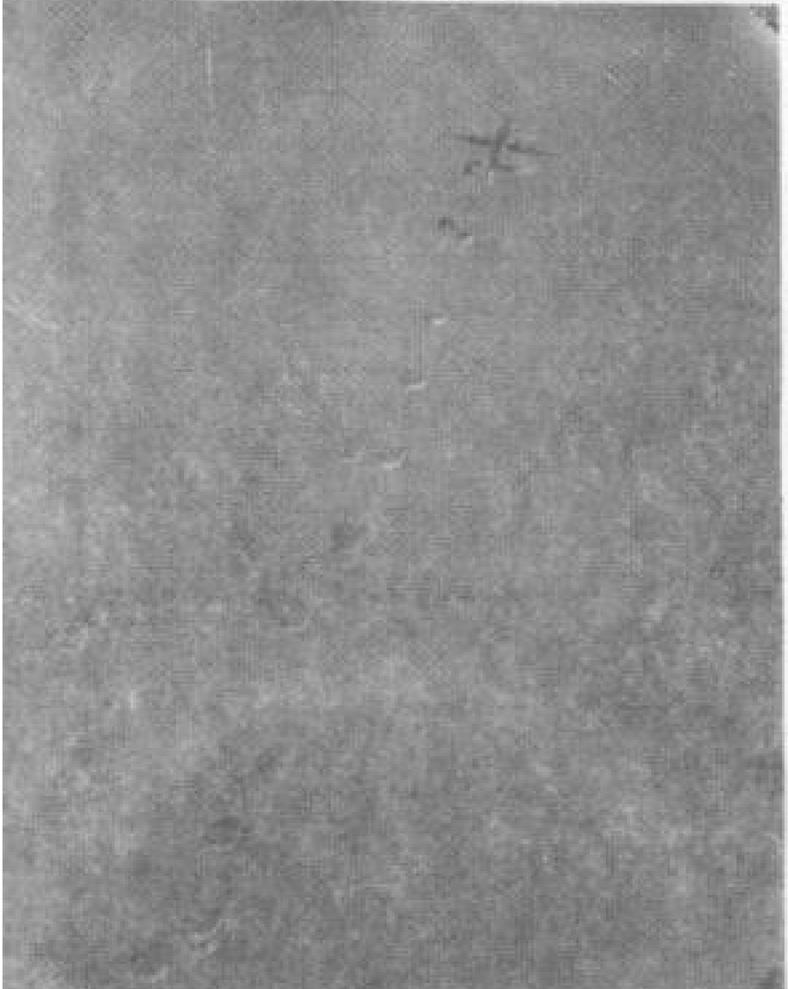
سورج آہستہ آہستہ بلند ہو چلا تھا۔ زمین نے تپنا شروع کر دیا تھا۔ کھڑے کھڑے تھک گئے تو بیٹھ گئے۔ پھر بھی چین نہ آیا تو پشتوں پر جھک گئے اور پیراشوٹ کی ٹیک لے لی۔ ایک دو بار شافتوں نے منع کیا کہ صاحب ایسے مت بیٹھیں۔ یہ فوجی طریقہ نہیں ہے بیٹھنے کا لیکن اس کے علاوہ بیٹھنے کی کوئی اور آرام دہ صورت نہیں تھی۔ صوبیدار صاحب کو بتایا گیا۔ انھوں نے ہانک لگائی:

"صاب۔ یہ پیراشوٹ ہیں گاؤ تکیے نہیں۔ کیا نوابزادوں کی طرح بیٹھے ہیں آپ لوگ۔"

لوگ شرمندہ سے مسکرائے۔ نیم باز نظروں سے صوبیدار صاحب کی طرف دیکھا، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ پہلے کون اٹھتا ہے۔ پھر اچانک سب کے سب سپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ صوبیدار صاحب نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔

"یہ جتنے لوگ ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، ان کے پیراشوٹ نہ کھلے تو میرا ذمہ [illegible]"

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند۔



اس کے بعد انھوں نے پھلجھڑیاں چھوڑنی شروع کر دیں۔ پہلے انھوں نے اپنے مشاہدات گنوائے۔ "وہ طلبہ جو ملک شیک اور فروٹ جوس کے رسیا ہیں اور خوشبوؤں کے پیچھے منڈلاتے پھرتے ہیں گزشتہ روز صدر بازار میں فقیروں کو پکڑ پکڑ زبردستی خیرات بانٹتے پائے گئے۔" بقول ان کے کچھ طلبہ ایسے بھی تھے جنھوں نے اذان

کی آواز پیدا ہونے کے بعد سے سنتی اور اب تک سنتے آئے تھے لیکن انھیں پہلی بار احساس ہوا کہ اذان کا مطلب نماز کے لیے پکار بھی ہے۔ یہ لوگ شہر کی جامع مسجد میں نوافل گزارتے سربسجود پائے گئے۔

صوبیدار صاحب نے ان نیک کاموں پر پسندیدگی کا اظہار کچھ یوں کیا:

"صاحب۔ اچھی بات ہے۔ لیا دیا کام آہی جاتا ہے آڑے وقت میں ورنہ جہاز سے چھلانگ لگانے کے بعد پیراشوٹ نہ کھلے تو لاش بھی پوری نہیں ملتی — ہیلمٹ اور جوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں صاحب تھے۔ پھر بکس میں پتھر ڈال ڈال ان کی لاش کا وزن پورا کرنا پڑتا ہے۔ تجہیز و تکفین کے وقت عزیز و اقارب منہ دیکھنا چاہیں تو انھیں روک دیتے ہیں نا صاحب! یہ فضائی شہید ہیں۔ ان کے منہ نہیں دیکھا کرتے۔"

دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا گیا کہ یہ کوئی موقع نہیں دل دہلانے کا۔ کوئی خوبصورت بات کریں۔ انسان خود خوبصورت نہ ہو۔ بات تو خوبصورت کر سکتا ہے نا۔ وہ بولے:

"خوبصورتی نظر آئے گی جب چھلانگ لگائیں گے آپ جہاز سے۔"

انھی باتوں کے دوران ایک دیوہیکل طیارہ رن وے پر اترا اور تیزی سے دوڑتا بھاگتا ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سب کو چپ سی لگ گئی۔ تمام شوخیاں رخصت ہو گئیں۔ صوبیدار صاحب کے چہرے پر بھی ایک گمبھیر سنجیدگی طاری ہو گئی۔

حکم ملنے پر ہم سر جھکائے قطار در قطار جہاز میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ اس جہاز میں داخلے کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ عام جہازوں میں تو شریف لوگ باقاعدہ سیڑھیوں کے رستے اوپر چڑھتے ہیں اور جہاز کے پہلوؤں میں بنے ہوئے دروازوں سے اندر جاتے ہیں لیکن یہاں دروازوں کی بجائے جہاز کی دم پوری کی پوری یوں کھل گئی جیسے کسی دیوہیکل وہیل مچھلی نے اپنا شکار نگلنے کے لیے جبڑا پھاڑ دیا ہو۔ کچھ دیر بعد دُم بند کر دی گئی۔ اب جہاز میں نیم تاریکی تھی اور ہمارے چہرے یوں لگ

(۲۸۱۱

رہے تھے جیسے کسی بوسیدہ قصباتی ہسپتال کے مایوس مریض۔

طیارے نے رن وے پر دوڑنا شروع کیا اور پھر ایک جھٹکے سے ارتعاش کے ساتھ فضاؤں میں بلند ہو گیا۔

سب لوگ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ صرف جہاز کے انجنوں کا شور تھا۔ جہاز اوپر جا رہا تھا...... اوپر...... اور اوپر...... اور ہمارے دل ڈوب رہے تھے۔

اچانک ایک سٹاف کی للکارتی ہوئی آواز ابھری، "ہو آر یو" (Who are you) جیسے صورِ اسرافیل دوسری بار پھونک دیا گیا ہو۔ سب لوگوں میں یکدم زندگی لوٹ آئی۔ اور ایک گرجتا ہوا جواب وصول ہوا۔ "ایئر بورن (Air born) ہوا بردوش۔"

اس کے بعد تو نعروں نے ایک تسلسل اختیار کر لیا۔ ایک کونے سے نعرے ختم ہوتے تو دوسری طرف شروع ہو جاتے۔ طلبہ چپ ہوتے تو سٹاف پوچھنے لگتے،

"ہو آر یو؟"

اس نعرے بازی سے توجہ بٹ گئی اور خوف قدرے جاتا رہا۔ اب نگاہیں جمپ ماسٹر پر جمی ہوئی تھیں جو دونوں قطاروں کے درمیان ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے سب کو نظر آ سکیں۔ اچانک جہاز کے دونوں طرف کے دروازوں کے عین اوپر سرخ بلب جل اٹھے۔ جمپ ماسٹر نے تالی بجا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ہاتھ کے اشارے سے بتاتے ہوئے پکارے، "سکس منٹ۔"

ڈراپنگ زون تک ہمارا صرف چھ منٹ کا سفر باقی تھا۔ پھر جیسے جاسوسی فلموں میں جرائم پیشہ لوگوں کی خفیہ غاروں کے آٹومیٹک دروازے کھلتے ہیں، ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ دونوں طرف کے دروازے اوپر اٹھ گئے۔ جہاز میں روشنی در آئی۔ ہوا آندھی بگولا ہو کر اندر گھسنے لگی جیسے اپنی پرامن فضاؤں میں ہماری پرواز پر زبردست احتجاج کر رہی ہو۔ اس کا بس چلتا تو جہاز الٹ پلٹ دیتی۔ اور ہم سب کو بیک وقت اٹھا کر زمین پر دے مارتی۔ لیکن اس کا پالا انسان سے تھا اور خدا نے فضاؤں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ جمپ ماسٹر نے پھر تالی بجائی اور پکارا "ٹو منٹ" — آخری دو منٹ۔

دو صدیوں پر محیط یہ لمحات جن میں جانے کتنی قیامتیں گزر جاتی ہیں شعوری یا لاشعوری طور پر جو نیکیاں انسان کے ہاتھوں ہوتی ہوں ان کے حوالے دے دے کر بس ایک ہی دعا بار بار لبوں پر مچلتی ہے " یا اللہ۔ ہمارا پیراشوٹ کھل جائے "۔

حکم ملا۔ کھڑے ہو جاؤ۔ ٹانگوں میں جسم کا بوجھ سہارنے کا یارا نہیں تھا۔ جہاز کی رفتار کی وجہ سے توازن برقرار رکھنا بھی مشکل تھا۔ پر حکم حاکم مرگ مفاجات۔ اٹھے لیکن ایسے ۔۔

جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

اس وقت کی کیفیات کے بارے میں صوبیدار صاحب نے ایک لطیفہ سنایا تھا جس پر ہمیں یقین نہ آیا تھا لیکن خود ان کیفیات سے گزرے تو اس لطیفے کی صداقت تسلیم کرنا پڑی۔

ایک بار جب حکم دیا گیا کہ کھڑے ہو جاؤ تو سب کھڑے ہو گئے سوائے ایک صاحب کے جو آنکھیں پھیلائے حیرت بھری نظروں سے باقیوں کو دیکھتے رہے جمپ ماسٹر نے ایک این سی او کو ان کے پاس بھیجا کہ نہ اٹھنے کی وجہ معلوم کرے این سی او نے جا کر خیریت دریافت کی تو جواب ملا :

" سٹاف ! میں بے ہوش ہو گیا "۔

سٹاف نے وہی رپورٹ جمپ ماسٹر کو دے دی۔ جمپ ماسٹر نے پیغام بھجوایا۔ کہ صاحب آپ اگر بے ہوش ہیں تو سب سے پیچھے چلے جائیں اور وہ صاحب بے ہوشی کے قریب ہوتے ہوئے بھی پیراشوٹ اٹھائے سب کے پیچھے جا کر دبک گئے۔ لیکن سکول والے اپنی تربیت کا ضیاع یوں ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے۔ جب سب جمپ جمپ کر چکے تو اس بے ہوش ہستی کو اٹھایا گیا، الٹ پلٹ کر اس کا ہارنس چیک کیا گیا۔ اور پھر جہاز سے باہر پھینک دیا گیا۔ سکول والوں کا کہنا ہے کہ جان پر بن آتے تو انسان خود بخود ہوش میں آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے موصوف ہوش میں آئے ہوں گے ورنہ آج ہم ان کا ذکر مرحوم و مغفور کے نام سے کر رہے ہوتے۔



مین پیراشوٹ نہ کھلنے پر ریزرو پیراشوٹ کا استعمال

یہاں کا ذکر تھا۔ ہمارا اپنا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ مشینی انداز میں ہم آخری مشقیں دہرا رہے تھے۔ جن کا مقصد آخری بار اپنا اور اپنے سے آگے کے ساتھیوں کا ہارنس اور پیراشوٹ چیک کرنا اور او کے رپورٹ دینا تھا۔ رپورٹ مکمل ہوتی تو جہاز کے دروازوں پر لگے سرخ بلب بجھ گئے اور سبز بلب روشن ہو گئے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ہم جمپ کر سکتے ہیں۔ جہاز محفوظ علاقے پر آ گیا ہے۔ جمپ ماسٹر کا حکم سنائی دیا :

"سٹینڈ اِن دی ڈور!"

سب سے آگے والے جمپر دروازوں میں ڈٹ گئے۔ حکم ملا:

"جمپ!"

اور اس کے ساتھ ہی قطار میں حرکت شروع ہو گئی۔ ہر کوئی تیزی سے آگے بڑھتا، اپنی سٹیٹک لائن جھٹکے سے آگے کی طرف دھکیلتا اور باہر فضاؤں میں گم ہو جاتا۔ ہم نے آخری بار کلمہ طیبہ کا ورد کیا، خدا سے اپنے کردہ، ناکردہ گناہوں کی معافی چاہی اور آگے بڑھے۔ جونہی دروازہ آیا، ہم نے آنکھیں بند کیں اور چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا، کچھ یاد نہیں۔ ایک جھٹکا لگا، ہم نے آنکھیں کھولیں اُوپر کی طرف دیکھا، چھتیس فٹ قطر کی ایک پُروقار چھتری ہم پر سایہ فگن تھی اور اس سے دُور پرے نیلگوں آسمان کی وسعتیں ہم پر مسکرا رہی تھیں۔ نیلی چھتری والے کے لیے احساسِ شکر کے ساتھ شوخیاں لوٹ آئیں۔ منہ سے بے اختیار نکلا:

"تھینک یُو۔ اللہ میاں!"

باقی جمپر بھی نعرے لگاتے ایک دوسرے سے باتیں کرتے محوِ پرواز تھے۔ اب خود بیدار صاحب کی بات یاد آئی۔ انھوں نے کہا تھا:

"خوبصورتی نظر آئے گی جب چھلانگ لگائیں گے آپ جہاز سے۔"

ایک تو ہم ہلکے پھلکے ہواؤں میں اُڑ رہے تھے، یہی ایک خوبصورت بات تھی۔ دوسرے نیچے زمین کی ہریالی تھی، چھدرے چھدرے مکانات تھے، صاف ستھری سڑکیں تھیں، ان پر رینگتی چھوٹی چھوٹی کھلونے نما گاڑیاں اور ان سب پر پرواز کرتے ہم بہت سے ساتھی۔ پہلی بار پاک فضائیہ کا موٹو (Air born) ہماری سمجھ میں آیا۔

صحرا است کہ دریا است تہِ بال و پرِ ما است

صحرا ہو یا دریا، سب کچھ ہمارے پروں کے نیچے ہے۔

ہماری دانست میں زمین ابھی خاصی دُور تھی، اس لیے بڑے اطمینان سے

اردگرد کے نظاروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ اچانک زمین نے تیزی سے ہماری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ہم پیراشوٹ سے چپک گئے اور ابھی حیرت ہی میں مبتلا تھے کہ دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ خُدا تو بھلا ہو ٹریننگ کے سٹاف کا کہ انھوں نے ہمیں لینڈنگ کی اتنی مشق کرائی تھی کہ لاشعوری طور پر ہم لینڈنگ پوزیشن میں تھے ورنہ اُتر گیا ہوتا ایک آدھ بازو یا ٹخنا۔ زمین پر گرنے کے بعد ہم نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی، اپنا جائزہ لیا اور خود کو صحیح سلامت پا کر کچھ حیران سے ہوئے کچھ خوش بھی۔ حیرانی اور مسرت کے یہ ملے جلے احساسات زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے کہ دُور ایک ٹیلے سے ایک سٹاف سر نکالے چیخ رہا تھا۔

"صاحب! یہ ڈراپنگ زون ہے۔ دشمن کا علاقہ ہے۔ بیڈ روم نہیں ہے۔ اُٹھ جائیں۔"

"اُف توبہ! کوئی ایسی جگہ ہے جہاں آپ لوگوں سے چھٹکارا مل سکے!" بڑبڑاتے ہوئے ہم اُٹھے۔ خود کو ہارنس سے آزاد کیا، پیراشوٹ لپیٹا، اسے ایک تھیلے میں ڈالا اور اگلی منزل کی طرف چل دیے۔

اس کے بعد پہلی دو تین چھلانگوں تک یہی عالم رہا کہ جہاز ہمیں رن وے سے اٹھاتا اور بلند ٹیلوں پر لے جاتا۔ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے عالم میں ہم جہاز سے کود جاتے، پیراشوٹ کھلتا تو آنکھیں کھل جاتیں، تب ہم نعرہ لگاتے شاداں شاداں دھرتی ماتا کی گود میں آ گرتے لیکن ابتدائی تجربوں کے بعد جب خوف جاتا رہا تو فیصلہ ہوا کہ پڑھائے گئے طریقوں کے مطابق آنکھیں کھلی رکھی جائیں اور ایک ایک لمحے کا مشاہدہ کیا جائے لیکن یہ ابتدائی مشاہدے سے بھی زیادہ دلچسپ تھے۔ ایک صاحب کے تاثرات:

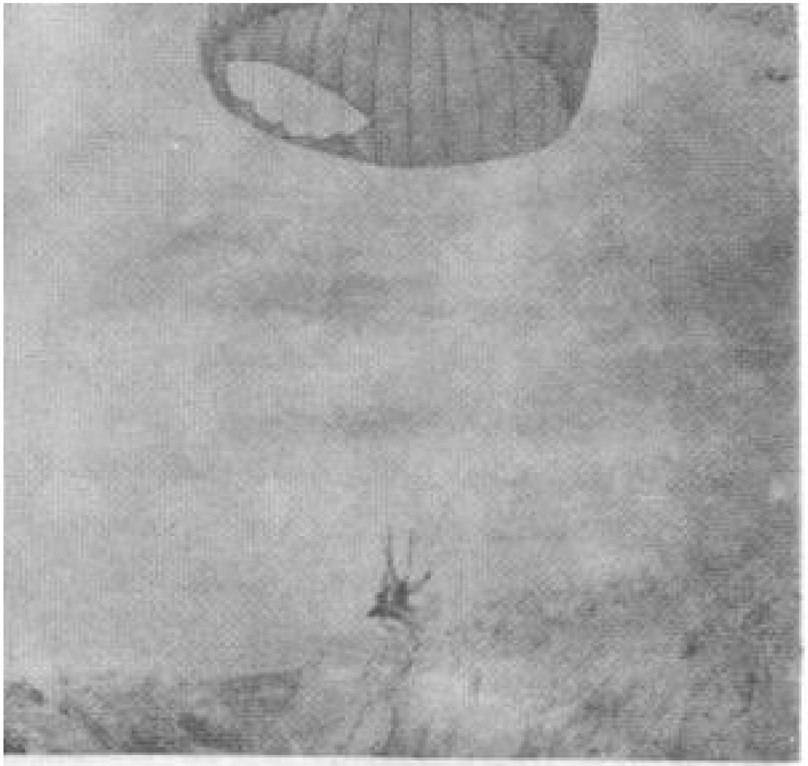
"میں نے فیصلہ کیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، اس بار آنکھیں کھلی رکھوں گا۔ دیکھوں گا کہ جہاز چھوڑنے کے بعد پیراشوٹ کیسے کھلتا ہے، جہاز قریب سے گزرتا کیسا لگتا ہے، باقی جمپر کیسے جمپ لگاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

میں آنکھیں کھلی رکھنے میں تو کامیاب رہا لیکن جمپ لگانے کے بعد کیا دیکھا کہ جہاز

میرے نیچے ہے۔ میں بڑا گھبرایا کہ شاید میرے ہلکا ہونے کی وجہ سے پیراشوٹ مجھے آسمان کی طرف اُڑائے لیے جاتا ہے لیکن یہ گھبراہٹ لمحے کے کچھ حصے کے لیے رہی۔ پیراشوٹ کھلا تو میں نے دیکھا کہ میں زمین ہی کی طرف جا رہا ہوں اور جہاز دُور ہے نقطے کی شکل میں جا رہا ہے۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ آنکھوں پر توجہ مرکوز رکھنے سے باقی پوزیشن برقرار رکھنا یاد نہ رہی اور چھلانگ لگانے کے بعد سر نیچے اور ٹانگیں اُوپر ہو گئیں۔ جہاز ٹانگوں کے بیچ نظر آنے سے یہی خیال ہوا کہ جہاز نیچے ہے اور میں اُوپر۔"

جمپ کرنے والوں میں جو سب سے پہلے جمپ کرتا ہے سٹک لیڈر کہلاتا ہے۔ اسے کچھ دیر جہاز کے دروازے پر کھڑا رہنا پڑتا ہے اور شانوں پر تھپکی ملنے پر جمپ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام جمپر بغیر ٹھہرے جمپ کرتے جاتے ہیں۔ ایک سٹک لیڈر کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

"دروازے میں کھڑا ہونے کا حکم ملنے پر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ جہاز میں سفر تو پہلے بھی کئی بار کیا تھا لیکن پی آئی اے کے جہازوں کی بند بند سی کھڑکیوں سے ایسے نظارے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئے تھے کہ پوری کائنات آپ کے سامنے وا تھی۔ نظروں کے عین نیچے چوکور، مستطیل، تکونی نما کھیت، کچھ فصلوں سے سجے، کچھ کھلیانوں سے بھرے، ان کے دائیں بائیں سایے حرکت پذیر تھے، چشمِ تصور سے میں نے مدھوری مٹیاروں کو چھاج چھٹکتے دیکھا، دائیں طرف آبادی سی تھی، جا بجا گھروں سے دھواں مرغولے بن بن کر اُوپر اُٹھ رہا تھا، بائیں جانب چمکتی دمکتی پتلی سی لکیر جو کسی نہر کے ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ اس کے بعد ریتلے میدان کا ایک سلسلہ، اس میں جا بجا جھاڑیاں .... اور .... اور .... اچانک سب منظر ایک دُوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ آسمان اور زمین نے ایک دُوسرے سے جگہیں بدل لیں .... میں اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا .... نیچے، نیچے اور نیچے۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ آنکھیں کھولیں تو پھر وہی منظر تھے .... لیکن اب میں جہاز کے دروازے میں نہیں کھڑا تھا، پیراشوٹ سے معلق تھا۔"



موصوف نظاروں میں اس قدر گم ہو گئے کہ انھیں شانوں پر تھپکی کا پتہ ہی نہیں چلا مجبوراً صوبیدار صاحب نے انھیں اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہو گا۔

پیراشوٹ جمپ کے ابتدائی تجربے اسی طرح کے ہوتے ہیں لیکن جب خوف جاتا رہتا ہے اور لوگ اس میدان کے کھلاڑی ہو جاتے ہیں تو سکائی ماسٹر (Sky master) کہلاتے ہیں۔ تب آسمان کی بلندیوں میں انھیں نت نئی شرارتیں سوجھتی ہیں۔ کئی کئی جمپر مل کر اکٹھے چھلانگ لگاتے ہیں کبھی ایک دُوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے دائروں کی شکل میں نیچے آتے ہیں۔ کبھی پھولوں کی شکل اختیار کرتے ہیں کبھی قومی پرچم میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے سٹاف اور سکول کے افسروں کو ہزاروں فٹ کی بلندیوں سے پیراشوٹ کھولے بغیر جمپ کرتے دیکھا۔ وہ گولی کی طرح زمین کی طرف آتے ہیں اور قریب آنے پر پیراشوٹ کھولتے ہیں۔ ایک

دفعہ ایک صاحب تو اتنا نیچے آ گئے کہ خیال ہوا کہ یہ پیراشوٹ کھولنا بھول گئے ۔ اور بقول ایک سٹاف کے شاید ان کی لاش کا قیمہ چمچوں ہی سے اٹھانا پڑتا لیکن یکدم پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور رنگ برنگے ایک پیراشوٹ نے گرتے ہوئے اس جسم کو پیار سے تھام لیا اور یہ صاحب آہستگی سے زمین پر یوں اتر گئے گویا صبح سویرے شبنمی گھاس پر چہل قدمی کے لیے نکلے ہوں۔

کچھ دنوں ہی میں ہم نے مطلوبہ جمپ مکمل کر لیں اور اس تقریب کا دن آ پہنچا جس میں تربیت کامیابی سے مکمل کرنے والوں کے سینوں پر ونگ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس دن تمام طلبہ کو اپنی اصل جون میں لوٹ آنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نمبروں سے پہچانتے اور پکارتے چلے آ رہے تھے۔ من و تُو کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔ رینک کا احساس ہٹ چلا تھا۔ وردیاں پہنیں تو ہر شخص کے شانوں پر پھول ستارے چمک رہے تھے۔ سینے کی دائیں جانب نام کی ایک تختی بھی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو نام لے کر پکارا تو خوشگوار حیرت کا سا احساس ہوا۔ نام لے کر پکارا جانا اپنائیت کی پہلی علامت ہے ۔

پھر مجھے لوگوں نے حیرت کی نظر سے دیکھا
"اس نے حسرت سے میرا نام لیا ہو جیسے"

سٹیج کو شامیانوں کی بجائے رنگ برنگی چھتریوں سے سجایا گیا تھا اور ان چھتریوں کے زیر سایہ وردیوں میں ملبوس مہمان افسروں کے علاوہ رنگ برنگے رنگ بھی لہرا رہے تھے زیر تربیت طلبہ کے قریبی عزیز و اقارب بھی اس تقریب میں مدعو تھے۔

مقررہ وقت پر مہمان خصوصی تشریف لائے ۔ تلاوت کلام پاک سے تقریب کا آغاز ہوا اور پھر انھوں نے خود اپنے ہاتھوں ترتیب سے کھڑے طلبہ کے سینوں پہ ونگ لگائے تقریب اختتام کو پہنچی۔ پریڈ برخاست ہونے کا حکم ملا۔ سب نے ایک ایک قدم آگے بڑھایا، پھرتی سے سیلوٹ کیا اور ابھی مبارکباد دینے کے لیے ایک دوسرے کی طرف مڑے ہی تھے کہ ایک گونج دار حکم سنائی دیا: "گٹ ڈاؤن" اور سب لوگ زمین بوس ہو گئے۔ ٹریننگ صوبیدار نے آخری لمحہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ ادھر چھتریوں کے سایوں میں بھی کھل کھلا رہے تھے۔